روبینہ میر
تفسیرِ حیات
شعری مجموعہ
مرتبین

نہایت خلوص و احترام کے ساتھ
حرف کاری کا ادنیٰ سا تحفہ
جناب سلیم سالک صاحب کی نذر
(برائے تنقید و تبصرہ)

[illegible]

تفسیرِ حیات

شعری مجموعہ

رُبینہ میر راجوروی

نام کتاب	تفسیرِ حیات
نوعیت	شعری مجموعہ
زیرِ طبع	حرفِ راز، ادھورے خواب
شاعرہ	رُوبینہ میر
مشغلہ	درس وتدریس
اشاعت	۲۰۱۶ء
کمپوزنگ	مختار رضوی، تسمیہ کمپیوٹر، پاور ہاؤس روڈ، کھیورہ، راجوری
قیمت	تین سو پچاس روپئے
ناشر	میر پبلیکیشنز، بہروٹ راجوری، جموں وکشمیر
رابطہ:	9469177786,9697555456,9086578722
ای میل:	rubinamir44@gmail.com

-: کتاب ملنے کے پتے :-

(۱) ہمالیہ بک سینٹر شہیدی چوک جموں
(۲) مکتبہ الہدیٰ ایجوکیشنل ٹرسٹ مدینہ کالونی راجوری
(۳) چاند بک سیلر مین بازار پونچھ
(۴) مکتبہ علم وادب مدینہ چوک گاؤکدل سرینگر

یہ کتاب جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوئجز کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

عُمر بھر میں کہ اُلجھتی ہی رہی ہوں خود سے
زِندگی! تو نے مجھے اپنا بھی ہونے نہ دیا

رُوبینہ

فہرست

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

خطۂ پیر پنچال کے بہترین خوش نویس، وخوش ذوق، وخوش مزاج اپنے دادا جان مرحوم الحاج عبدالرحیم میر اور دادی جان مرحومہ زون بیگم کے نام جو اپنی ہمہ پہلو شخصیت کے لحاظ سے اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ بقول شاعر:

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جُستجو
رَزم ہو یا بزم ہو پاک دِل و پاکباز

خطۂ پیر پنچال کے ماہرِ اقبالیات، نڈر و بیباک قائد نانا جان مرحوم (کامریڈ) غلام قادر میر اور نانی جان مرحومہ رحمت بیگم کے نام۔

اپنی مشفق و مہربان والدۂ محترمہ ظریفہ میر کے نام جن کی آغوش میں میں نے اپنی زندگی کی آنکھیں کھولیں اور جن کی تربیت و کردار سازی کے باعث میں علم و ادب کی دنیا میں قدم رکھنے کے قابل ہوئی۔ بقول علامہ اقبال:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

خلوص کیش:

رُوبینہ میر

پیش کلام

اُردو زبان جموں و کشمیر کی درجن بھر سے زیادہ پیڑھیوں کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی ہے لیکن اب اس کو کہیں انگریزی اور کہیں ہندی جیسی شاہ زادیوں نے اپنا دامن سمیٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ مُشک سے مالا مال اس غزالہ نے اپنی پسپائی میں ریاست کے اُس کونے کھدرے کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا ہے جو شمال و مغربی کوہساروں کی آغوش جنگل، دریا اور ہریالی کی پوشاک سے آراستہ ہے اور جو غزالاتِ دشت کے لئے چوکڑیاں بھرنے کا دامن اور مسکن ہوتا ہے۔ اس وقت پونچھ اور راجوری کا علاقہ اُردو سخن سرائی اور سخن نوازی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ میرے بوڑھے حافظے کے لئے اِن شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوانا خاصا دُشوار ہے۔ اس اَبنوہِ سخن سرایاں میں ایک دلکش آواز زیرِ نظر مجموعے کی شاعرہ روبینہ میر کی بھی ہے۔ روبینہ کے اپنے اعتراف کے مطابق اُس کی سخن گوئی کی معیاد کوئی تین چار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''تفسیر حیات'' اُس کی محض دوسری شاخِ نبات ہے۔ مگر یہ برسات ابھی چھم چھم برس رہی ہے، اس کتاب میں حسبِ معمول غزلیں زیادہ ہیں۔ نظمیں بھی بہت سی ہیں۔ لیکن مجھے اس کی مختصر نظموں نے بہت زیادہ لُطف اندوز کیا، اِن میں ردیف، قافیے کی کشیدہ کاری سے زیادہ ایک بولتے ہوئے آہنگ اور اُس کے من سر کی کسی بپھری ہوئی موج نے رنگ بھر دیا ہے۔ اِس بہت سی مختصر نظم ''بددعا'' کو لیجئے یہ اتنی ہی عوام آسا اور عام پسند ہے جتنا کسی پہاڑی جھرنے کے پانی کا ایک گھونٹ، قدرت کی سب سے زیادہ خوبصورت، خوش پسند اور انسان پرور چیزیں مفت اور سستی ہیں۔ پانی، ہوا، پھول، پرندے۔ اُن کی آواز اور چہچہاہٹ، ماں کی ممتا، سچے عاشق کی وارفتگی۔ اس آفاقی سچائی کی کتنی اچھی تصویر روبینہ نے چند ہی لفظوں میں کھینچی ہے۔ آج کی دنیا کا ہر حساس قاری اس پرزور سے بول اٹھے گا۔ بالکل سچ۔ میرے دِل کی بات روبینہ! تم سے کس نے کہی۔ نظم کا عنوان ہے 'بددعا'

اتنا دُکھ دے کر بھی

کیا من نہیں بھرا

آپ کا
جو ایسی بد دعا دے رہے ہو کہ
اللہ آپ کی عمر دراز کرے
اس سے بڑھ کر
اور کیا ہو سکتی ہے؟
'بد دعا'

شاعرہ اس دکھ پر اس لئے ملال ظاہر کر رہی ہے کہ اُس نے عاشق کے سارے انداز دیکھے اور جھیلے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کی اس ازلی اور ابدی کھیل کی شیرینیوں اور تلخیوں کو آزما چکی ہے۔ چند سرگوشیوں کو سن کر ہی سارا ماجرا سامنے آجاتا ہے۔

محبت کے یہ بھی تو آداب ہیں۔ اگر روٹھ جاؤں منایا کرو
روبینہ یہ سمجھے کہ اس کے ہو تم۔ کبھی اس طرح پیش آیا کرو

☆

بڑا عجیب سا اُس سے میرا تعلق ہے
میں اسکا سایہ ہوں لیکن وہ مجھ کو دکھتا نہیں

☆

میں نے سوچا بھی نہ تھا میں ڈھونڈتی رہ جاؤں گی
خواہشوں کی بھیڑ میں دِل لاپتہ ہو جائے گا

لیکن غزل کی کلاسیکی کاوش تو یہی قرار پائی ہے کہ عورت اور مرد کی لطیف گفتگو ہو، اگرچہ اصل زندگی میں یہ لفظ و معنی نگاہوں کی ہی بے آواز تار برقی سے کہے اور سُنے جاتے ہیں۔ الفاظ اس صاعقے کو کچھ تو ادا نہیں کر سکتے اور کچھ وہ اس کی روشنی کو آلودہ بھی کرتے ہیں۔ ہماری شاعرہ اس رمز سے بخوبی آشنا ہے لیکن اس کی تانیثی ذہانت حریف مخالف کو لاجواب بھی کرتی ہے اور اُس پر زیرِ لب مسکراتی بھی

ہے۔ یہاں کلیدی لفظ دانستہ ہے۔

دِل میں کیا ہے دانستہ مجھ سے کبھی کہتے نہیں
مسکرا دیتے ہیں روبینہ وہ مجھ کو دیکھ کر
کیا کہوں میں بے ثمر ہو گئے سارے شجر
جب سے میرے گلستاں کا باغباں ناراض ہے

آخری شعر میں کلام وکنار کی کتنی آرزوئیں مچل مچل رہی ہیں جیسا کہ اوپر اِشارہ کیا گیا ہے ہراک خاندانی راج کی طرح اُردو میں غزل کی فرمانروائی اب اِستبداد اور استحصال کی حدود کو چھو رہی ہے۔ یہ عمر رسیدہ صنف اپنے پیرائے اور پیمانے بدل بدل کر بھی اپنی فرسودگی کو ڈھانپ لینے میں مشکلیں محسوس کر رہی ہے۔ روبینہ کے یہاں بھی اظہار کے یہ Flashes کہیں کہیں چمک کر اُردو کی بانوئے شعر کی نئی اداؤں نداؤں کے تیور دکھا رہی ہیں۔ مثلاً ایک نظم کے یہ چند مصرعے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے کرتبوں کے سارے لچھن عکس بند کرتے ہیں۔

مچھلی کو معلوم نہ تھا
پانی میں تھا
جال نہ پوچھ

جال کی دُہائی دے کر بدن پیٹنا تو ٹھیک ہے لیکن اِس نوکِ سوزن سے طبقۂ نسواں کی بے چارگی کا اونٹ گزار دینا نئے شاعر کی اپنے میڈیم پر قدرت کا منہ بولتا ہوا نمونہ ہے۔ اس مجموعے کے دیگر تقریظ کاروں نے رُوبینہ کے کلام کے مختلف زاویوں کا اچھا جائزہ لیا ہے اور اس بارے میں تأثرات کی مختلف دھاریاں آراستہ کی ہیں۔ اس لئے میرے لئے بات کرنے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس احساس سے معمور ہونے کے باوجود میں اِس مجموعے کی نظم "مذمّت" پر کچھ کہنے سے گریز نہیں کر سکتا۔ اس نظم میں شاعرہ کے اندر کی عورت عجیب شوخی کے چتون دکھاتی ہے اور میری دانست میں اس کا مخاطب اُس کی صنف کا مخالف مارا ہوا مرد ہے۔ اِس نظم کو اس کی ہمجولی عورت ضرور پڑھے۔ مگر وہ اس کی مخاطب نہیں ہے۔ نظم کی عورت اپنے Jilted سے کنارہ کر چکی ہے۔ نظم کی نائکہ کو اپنی فتوحات کا

احساس ہے اور وہ اس سے آسودہ بھی ہو چکی ہے۔ وہ درماندہ عاشق کی نئی تلملاہٹ پر ایک ناز آفرین معشوقہ کی طرح کھِلکھِلا رہی ہے کہ اس کے بدن کی تازہ تلاش میں بے چارہ عاشق پہلے سے بھی زیادہ تڑپ رہا ہے کہ اُس نے اس چمن زار کے سارے رنگ اور خوشبوئیں بھوگی اور Enjoy کی ہیں۔ عاشق کھیل کھیل میں ضرور کچھ دیر کے لئے اوب گیا تھا۔ لیکن وہ جنتِ گمشدہ سے پھر ہم آغوش ہونے کے لئے اب سراپا طلب اور تڑپ بن گیا ہے۔ نظم کی عورت آنکھوں میں ساری رعنائیوں اور شوخیوں کو لے کر اس کو پھر لُبھا رہی ہے تا کہ اس کی وقتی آسودگی کے جرم کے لئے اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا سکے۔ لیکن وہ جسم کی لطافتوں کی سپردگی کے بدلے نامراد عاشق کو ایک غیر مجسم نیزے کی انی سے گھایل کر کے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر اُس آشوبِ عالم کی فتنہ انگیزیوں کو محسوس کیجئے جس نے ہمارے جدِ امجد بابا آدم کو فردوس سے زمین پر دھکیلنے کی کارستانی انجام دی تھی۔ اس نظم کا سارا انداز ڈرامائیت کا آئینہ ہے۔ جہاں نائیکہ کچھ اپنے شکار مرد کو تباہ حال کرنے کے بعد کن انکھیوں سے اپنی طاقت کا جشن منا رہی ہے۔ مجھے اگر کوئی اُردو نظم کا ایک انتخاب کرنے کی ذمہ داری کے قابل سمجھے تو میں اِس نظم کو شاعرہ کی نو آموزی اور کم نامی کے باوجود اُس میں شامل کروں گا۔ اِس فن پارے کو گنگنائے اور عورت کی عشوہ طرازیوں اور شعبدہ بازیوں کا لطف اٹھائیے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ذہن میں جو پیکر اُبھرتا ہے وہ ایک عشوہ طراز حسینہ کا ہے۔ جو آمادۂ کنار عاشق کو خندۂ زیرِ لب کے ساتھ انگوٹھا دکھا رہی ہے۔

"مذمت"

اِک بار نہیں

بلکہ بار بار آؤں گی میں

تمہارے پاس

جب ہوں گے تم اکیلے تنہائی میں

کوئی نہ ہو گا تمہارے پاس

دہراؤں گی ماضی کا اِک اِک پل

کھو جاؤ گے تم

کچھ دیر کے لئے (خیالوں کی دُنیا میں)

تڑپاؤں گی میں تمہیں

بن پانی کے مچھلی کی طرح

کوسو گے تم اپنے آپ کو

جب تمہیں ہو جائے گا احساس

اپنی غلطی کا

مگر کر نہ سکو گے مجھ سے اظہار

معافی مانگنا بھی چاہو گے

مگر

مانگ نہ پاؤ گے

کیوں کہ وہ میں نہ ہوں گی تمہارے پاس

بلکہ ہوگی

میری یاد

میری اِس جزوی تعریف سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اِس مجموعے میں سب کچھ چُست اور درست ہے۔ اِس میں روایتی، معمولی اور کبھی کبھی عامیانہ اشعار بھی موجود ہیں۔ بہت سی صورتوں میں یہ دوسروں کی آوازوں کو بازگشت کرتے ہیں اور کبھی کبھی شعریات کے حدود سے باہر کے معاملات کو بھی گنگنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گُستاخی کے لئے معذرت خواہ ہونے کے بعد میں کہنا چاہوں گا کہ اِس مجموعے کا اچھا انتخاب اسکی بہتر شکل پیش کرتا۔ کاش ہمارے شعراء اُردو کے یزدانِ سخن مرزا اسداللہ غالبؔ سے اشعار انتخاب کرنے کی روِش سیکھ سکیں۔ مرزا نے اپنا سارا کلام مولانا فضل الحق خیر آباد کو سونپا اور جو کچھ انہوں نے چنا اس کو بلا حجّت زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ نتیجہ کیا ہے کہ یہ مختصر سا دیوان اُردو

کا شائد سب سے روشن فانوس بن گیا ہے۔

روبینہ میر نے اپنے مجموعے میں تانیثی Sensibility کے چند نمونے پیش کئے ہیں جہاں جہاں اپنے جسم پوش ہم نوا سے اپنی شعری دنیا میں لمس پاسکی ہے وہاں شاعری کی ساحرہ نے اُس پر اپنے سارے لطف اور رنگ ارزان اور آسان کر دئے ہیں اور ہمیں اُس سے رنگوں کی اِس سے بڑی دھنک کی اُمید ہے۔

محمد یوسف ٹینگ
حکیم باغ
راولپورہ، سرینگر
۳۰ر جون ۲۰۱۴ء
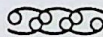
رُوبینہ میر کی شاعری
(تفسیرِ حیات کی روشنی میں)

جموں وکشمیر کے شعری اُفق پر حالیہ برسوں میں ایک ایسی شاعرہ نمودار ہوئی ہے جس کا شعری سفر دہائیوں پر محیط نہیں ہے بلکہ کُل تین برس اور کچھ ماہ پر پھیلا ہوا ہے لیکن اُس کی زرخیز تخلیقی ذہنیت نے ریاست کی خواتین اُردو شاعری کے باب میں نہ صرف اپنے نسوانی جذبات واحساسات کو بلکہ سماج کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنا کر اہم اضافہ کیا ہے۔ میری مراد رُوبینہ میر سے ہے۔ موصوفہ ضلع پونچھ اور راجوری کی واحد خاتون ہیں جو اُردو شعروشاعری کے ذریعہ بہت کم عرصے میں اُردو ادبی حلقوں میں ایک پہچان قائم کر چکی ہیں۔ ۳۸۱ صفحات پر مشتمل اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''آئینۂ خیال'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے جس کی اُردو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ ''تفسیرِ حیات'' اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو مسوّدے کی صورت میں میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ مسوّدہ بہت جلد پریس میں جانے کے بعد کتابی رنگ روپ اختیار کرے گا۔

رُوبینہ میر کا دوسرا شعری مجموعہ نہ صرف قافیہ بند غزلوں پر مشتمل ہے بلکہ اُن کی متنوع موضوعات پہ آزاد نظمیں قاری کو نئے فکرواحساس اور ایک نئی مگر قریب آسا سماجی صورت حال سے بھی آگاہی فراہم کرتی ہیں۔ رُوبینہ میر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے دَوران میں نے بہت سے اشعار ایسے پائے جن میں معنی آفرینی، جذبے کی صداقت، خیال کی پاکیزگی اور جذبے کی ترسیل کا راست بیانیہ تو ہے ہی اس کے علاوہ آدمی اور انسان میں افتراق اور عورت کی عظمت کا اعتراف مگر مرد غالب معاشرے میں اس کی تذلیل اور سماجی نابرابری کا دُکھ، یہ تمام باتیں رُوبینہ کی شاعری میں در آئی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات ومشاہدات سے سطحی طور پر نہیں گزر جاتی ہیں بلکہ ایک حساس شاعرہ کی حیثیت سے اپنا شعری ردِعمل بھی بیان کرتی ہیں۔ بات ادھوری رہ جائے گی اگر میں رُوبینہ میر کے اشعار کو یہاں بطورِ حوالہ پیش نہ کروں، اس لئے اُن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا بتاؤں میرے دِل کی یہ بے بسی
کتنے آنسو بہاتی رہی رات بھر
کتنے پردوں میں رہ کر بھی اُس کی نظر
میرے دِل کو لبھاتی رہی رات بھر

☆

جس کو رہبر سمجھتا رہا قافلہ
وہی قاتل ہوا آج کے دَور میں

☆

کئے ظلم اُس نے کیا کیا میری زندگی سے پوچھو
یہ داستانِ حسرت میری بے بسی سے پوچھو
اس زندگی کی رَہ میں اُس نے قدم قدم پر
دھوکے دیے ہیں کیسے میری سادگی سے پوچھو

☆

وہ کل تک نہ کھاتے تھے میری قسم
مگر آج اُن کو یہ کیا ہو گیا
جفا میں نہیں جس کی کوئی مثال
یہ سنتے ہیں وہ باوفا ہو گیا

☆

عجب لوگ ہیں آج کے دَور کے یہ
میں جینا بھی چاہوں تو جینے نہ دیں گے

☆

ہو رہا ہے کیا یہ میری جان میرے شہر میں
گھومتے ہیں ہر طرف شیطان میرے شہر میں
سنسنی، بے آئینی، رِشوت ستانی رہزنی
کس قدر سیاست کے ہیں احسان میرے شہر میں

رُوبینہ میر کے ان اشعار میں اُن کا شعری رویّہ جہاں عورت کی بے بسی و مظلومیت اور اُس کے دَردو کرب کی مؤثر ترجمانی کرتا ہے تو وہیں انہوں نے اُن تمام سماجی برائیوں کو بھی طنز و رمز کا ہدف بنایا ہے کہ جو سیاسی بازی گروں ہی کی دَین کہی جاسکتی ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ رُوبینہ میر جس سماج و معاشرے میں سانس لے رہی ہیں، اُس میں رُونما ہونے والے حالات و واقعات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ وہ اُن کا شاعرانہ نوٹس بھی لے رہی ہیں وہ جب اخلاقی اور رُوحانی قدروں کی پامالی دیکھتی ہیں تو تڑپ اُٹھتی ہیں، وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ عورت کا سماج میں کیا مقام و مرتبہ اور اہمیت ہے مگر اس کے باوجود مرد غالب معاشرے نے اُس کے استحصال کے لئے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں کہ وہ بے بسی اور مجبوری کے احساس میں اپنے شب و روز گذارنے پر مجبور ہو چکی ہے۔ اس احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری سے نجات پانے کے لئے رُوبینہ میر اپنی ایک غزل میں مرد غالب معاشرے کو للکارتی ہوئی کہتی ہیں۔

زباں رکھتی ہوں میں بھی منہ میں اپنے اے زباں والو
مجھے کمزور مت سمجھو کسی صورت جہاں والو
کبھی تُو کر نہیں سکتا مجھے جو کام بخشا ہے
مجھے اِنسان کی تخلیق کا انعام بخشا ہے

☆

بطن سے میرے تو پھوٹا ہے خود پہ ناز کرتا ہے
میرے ہی سامنے چلاتا ہے، آواز کرتا ہے

حقیقت ہے میرے اِن قدموں کے نیچے ہی جنت ہے
اِسی جنت کی گہرائی میں دُنیا بھر کی راحت ہے
جہاں میں میرے ہی دَم سے تیرا یہ بول بالا ہے
تیری اس بے حسی نے مجھ کو تو حیرت میں ڈالا ہے

رُوبینہ میر کے کلام کے حوالے سے یہ بات انتہائی خوش کن، اطمینان بخش اور ان کے روشن مستقبل کا علامیہ کہی جاسکتی ہیں کہ وہ مشرقی اقدار و روایات، آدمی کو انسان بن کے جینے اور بالخصوص مشرقی خاتون کو مغربی تہذیب کی مسموم ہواؤں سے دُور رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ اُنہیں اس بات پہ کامل ایقان ہے کہ عورت فطری طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور ہے مگر بعض موقعوں پر وہ اپنی فہم و فراست اور حکمت عملی کے لحاظ سے مرد سے دو قدم آگے رہتی ہے۔ وہ اس بات پہ مصر نظر آتی ہیں کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق نیک اور صالح کردار پر استوار ہونا چاہیئے۔ یہی نیک نیتی کا جذبہ رُوبینہ میر سے اس طرح کے اشعار کہلواتا ہے:

وہ کرتے ہیں جو بھی مُبارک ہو اُن کو
مگر اُن سے کچھ تو جدا ہم کریں گے
میسّر ہو سب کو سکوں زندگی کا
یہ ہر اک کی خاطر دعا ہم کریں گے

☆

نہ جانے میرے دل میں ایسی بات کیسے آ گئی
کہ اُس کو رُسوا کر دیا مذاق ہی مذاق میں

☆

تنکا تنکا جوڑ کر ہم نے بنایا آشیاں
لے اُڑی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے یہ آندھیاں

بیچ ڈالیں کب وطن کو ہم یہ کہہ سکتے نہیں

رہزنوں کی رہبروں سے ہوتی ہیں سرگوشیاں

☆

ہم سچ کو سچ ہی کہتے رہیں گے

جو بھی ستم ہو سہتے رہیں گے

رُوبینہ میر کے محولہ اشعار میں زمانے، ماحول و معاشرے کے تلخ حقائق کا تجربہ و مشاہدہ قاری کو غور و تدبر پہ راغب کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ رُوبینہ میر ایک ایسی شاعرہ کے روپ میں ہمارے سامنے آئی ہیں جس کے پاس حِسّی، سمعی اور بصری قوت کی کمی نہیں، مسائل حیات کے حل و عقد میں کبھی کبھی انسان اس قدر اُلجھ جاتا ہے کہ وہ زندگی سے فرار کی راہیں تلاشنے لگتا ہے یا پھر کبھی کبھی وہ زندگی کی تلخیوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے معمولاتِ زندگی میں غیر متوازن صورت حال اختیار کر لیتا ہے۔ رُوبینہ ایسے نازک موقعوں پر بڑے ناصحانہ انداز میں کہتی ہیں:

رفتہ رفتہ وہ مری باتوں کے قائل ہو گئے

ہوتے ہوتے اس طرح حل سب مسائل ہو گئے

زندگی میں ہر مصیبت سے ملی اُن کو نجات

زندگی میں جو بھی تیرے دَر کے سائل ہو گئے

کیا بتاؤں دیر تک پھر سلسلہ جاری رہا

جب کبھی بھی بات کرنے پر وہ مائل ہو گئے

کٹ رہی تھی زندگی رُوبینہ کتنی پر سکوں

لوگ میرے اور اُن کے بیچ حائل ہو گئے

موزوں طبیعت کی وجہ سے رُوبینہ میر کے کلام میں روانی، شگفتگی، معنی آفرینی اور لطافت و نفاست خیال کے ساتھ ساتھ لفظ و معانی کی ہم آہنگی کا عنصر جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے اُن کی غزلوں کے بہت سے

اشعار اخلاقی و روحانی اور سماجی اقدار کی بحالی پر قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں کچھ ایسے بھی اشعار ہیں جن میں تفکر و تدبر کے علاوہ ضرب المثل کی چاشنی موجود ہے۔ رُوبینہ میر کے غزلیہ حصے میں نہ تو روایتی حسن و عشق کا تذکرہ ہے اور نہ ہی مخرب اخلاق اور حیا سوزی والے اشعار نظر آتے ہیں بلکہ وہ تو حال سے زیادہ مستقبل کی فکرمند شاعرہ معلوم ہوتی ہیں۔ بدلتے ہوئے تہذیبی و ثقافتی منظر نامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ امن و آتشی کی متمنی، مسلم اسلاف کی متاعِ عزیز اور اسلامی تہذیب و کلچر کو نجاتِ انسان کا مؤثر ذریعہ خیال کرتی ہیں۔ مزید برآں دُنیا کی بے ثباتی اور موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی پہ کامل یقین، نیک اعمال کی فکر اور حدِ امکاں سے آگے کی سوچ روبینہ میر کا شعری اختصاص ہے۔ اسی ضمن میں اُن کے کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجئے۔:

ہم آئے ہیں اگر دُنیا میں اک دن لوٹ جانا ہے
کرائے کا مکاں ہے یہ اسے کب تک سجانا ہے
بھروسہ کر رہے ہیں کس قدر اس زندگی پر ہم
یہ مٹی کا گھروندہ ہے کسی دِن ٹوٹ جانا ہے
نہ دستورِ وفاداری نہ وہ اِخلاص کی باتیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ کیسا زمانہ ہے

☆

نہیں مل سکے گا کہیں پر بھی سایہ
بشر کیوں یہ سارے شجر کاٹتا ہے
کوئی کر سکے گا نہ انکار اس سے
جو بوتا ہے ویسا ثمر کاٹتا ہے

☆

تو ہندو بن کے جی نہ مسلمان بن کے جی
جینا ہے زندگی میں تو انسان بن کے جی
جس پر جہاں کو رشک ہو وہ شان بن کے جی
اس زندگی میں حق کی اک پہچان بن کے جی

☆

ہمیں مال و زر سے نہیں کوئی رغبت
نہ اس کی کبھی ہم نمائش کریں گے
غلط کو غلط ہی کہیں گے رُوبینہ
نہ ہم اس کی ہرگز ستائش کریں گے
رُوبینہ ازل سے ہی درویش ہیں ہم
کسی جھونپڑے میں رہائش کریں گے

☆

اتنی توفیق ہو یہ دُعا کیجئے
جیسے ممکن ہو سب کا بھلا کیجئے
جس کے باعث تھی آدم نے پائی سزا
ایسی ویسی نہ ہرگز خطا کیجئے
ایسا کرنا نہیں ہے عبادت سے کم
فرض جو بھی ہو اپنا ادا کیجئے

رُوبینہ میر کی آزاد نظمیں بھی اپنے موضوع اور شعری اُسلوب کی بنیاد پہ خاصی دلچسپ، سبق آموز اور بہت حد تک عصری مسائل و معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ دراصل عصری سماج کے جس میں سائنسی، مشینی اور کمرشیل کلچر کا عفریت انسان کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو تہس نہس کر رہا ہے۔ ایسے

تشویشناک ماحول میں امن وسکون کی راہیں تلاش کرنا اوران تمام فریب کاریوں کی مذمت کرنا کارِ خیر ہی کہا جاسکتا ہے کہ جن کے باعث زندگی مفلوج ہو کے رہ گئی ہے۔رُوبینہ میر نے اپنی چھوٹی نظموں میں یہی کام کیا ہے۔میرے خیال میں آج کے نیک انسان کو جوسب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ ہے منافقت کی ستم ظریفیاں اور تعلیمی و اطلاعاتی ذرائع ابلاغ کی بہات میں بے عمل آدمی سے مقابلہ! بلاشبہ رُوبینہ میر کی آزاد نظموں کا دائرہ اسی تشویشناک صورتحال پر محیط ہے۔اُن کی آزاد نظموں میں ''قیمت''۔''پہچان''۔''وجہ''۔''چڑھتے سورج کو سلام''۔''مہا بیوقوف''۔احساس''۔تماشائی''۔جان''۔خدا حافظ''۔بھیانک رات''۔رشتہ بھروسے کا''۔ایمانداری''۔آجکل''۔باغی پرندہ''۔ملیریا نہیں لوّیریا''۔ایسی نظمیں ہیں جو اپنے موضوع اور فنی برتاؤ، فکر وخیال اور زبان وبیان کے اعتبار سے قاری کو نہ صرف نئی آگہی فراہم کرتی ہیں بلکہ اُسے شعری لطف اندوزی بھی حاصل ہوتی ہے۔یہاں یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ رُوبینہ میر کی چند نظموں کو بھی بطورِ حوالہ پیش کیا جائے۔مثلاً! رُوبینہ کی ان آزاد نظموں پہ غور کیجئے۔:

''دال میں کالا''

یہ
تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟
کہ
کھاتے ہی جارہے ہو
باوجود
اس کے
کہ
دال میں کچھ کالا ہے

☆

''عارضی رہائش''

چُن چُن کے تنکے

یہ پرندے

کیوں بناتے ہیں؟

آشیاں

باوجود

یہ جاننے کے

کہ

ان کی ہے

عارضی رہائش

☆

''ٹوٹ گیا''

افسوس۔۔۔!

کتنی کمزور تھی

بنیاد

اس رشتے کی

جو

ہوا کے ایک جھونکے سے

ٹوٹ گیا۔۔۔

☆

''انجام''

آخر

وہی ہوا

جس کا مجھے ڈر تھا۔۔۔؟

جس کی مجھے فکر تھی۔۔۔؟

جس کا مجھے خوف تھا۔۔۔؟

یعنی

جھوٹ۔۔۔!

فریب۔۔۔!

دھوکہ۔۔۔!

اجنبی شہر میں

انجان راستوں پر

چلنے کا

یہی تو ہے

انجام

☆

''تماشائی''

ہو رہا ہے

ہماری آنکھوں کے سامنے

انسانیت کا قتل۔۔۔!

اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔!

ہو رہی ہے

زخموں پہ نمک پاشی

اور ہم ہیں تماشائی

☆

زمینی حقائق سے جڑی مذکورہ آزاد نظمیں دراصل تغیر پذیر سماج و معاشرے کی عطا کردہ ہیں۔ رُوبینہ میر نے ان نظموں میں بڑے اختصار اور پورے شعری وزن کے ساتھ ہمارے معاشرے کا بھیانک عکس پیش کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاں موبائل فون، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، لیپ ٹاپ اور پرنٹ میڈیا کے غلط استعمال نے ہماری اخلاقی، روحانی، سماجی اور تعلیمی قدروں کا جنازہ نکال دیا ہے وہیں سنجیدہ ادباء وشعراء کا حساس طبقہ اُن تمام اقدار و روایات کی جانب مراجعت پر زور دیتا ہے کہ جن کی حدود میں رہتے ہوئے آدمی انسان بنتا ہے۔ رُوبینہ میر نے اپنی ایک آزاد نظم ''ملیریا نہیں لوّیریا'' میں ہمارے جدید معاشرے کی ایک تلخ سچائی کو بڑے طنزیہ و رمزیہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

''ملیریا نہیں لوّیریا''

ڈاکٹر

آج پھر وہی

بے چینی بے قراری

وہی تناؤ

سر میں چکر

خون کی جانچ بھی کروائی

مگر

رپورٹ ایک دم صاف

آپ کو ملیریا تو نہیں۔۔۔؟

جو خون کی جانچ کروائی ہے

تو پھر کیا ہے ڈاکٹر۔۔؟

آپ کو تو لوّیریا ہے

اُف۔۔۔۔!

ڈاکٹر وہ کیا بیماری ہے۔۔۔؟

دیکھو گھبرانے کی ضرورت نہیں

سائنس دانوں کی تحقیق سے معلوم ہوا

کہ دُنیا میں ہر تیسرے بندے کو یہ بیماری ہے

کیونکہ

اس بیماری کے بیکٹریا ہر جگہ پائے جاتے ہیں

ڈاکٹر

کیا یہ کسی زہریلے مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے؟

نہیں بیوقوف۔۔۔!

یہ بیکٹریا صرف

انسان کے اندر رہوتے ہیں

وہ بھی

کسی کی آنکھ میں

کسی کی ذات میں

کسی کی بات میں

کسی کے ساتھ میں

ڈاکٹر

اس کا علاج۔۔۔!

بہت مشکل۔۔۔؟

ہاں

ایک صورت میں

ہوسکتا ہے

وہ کیسے۔۔؟

اگر وہ شخص مل جائے۔

☆

رُوبینہ میر کے کلام میں پیچیدہ تشبیہات واستعارات، علامتیں، رمز و کنائے اور شعری تراکیب کم ہی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں انہوں نے دانستہ طور پر عام اور سلیس الفاظ میں اپنے جذبات و احسانات، افکار ونظریات اور تجربات ومشاہدات کوشعری جامعہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ مانا کہ اعلیٰ شاعری میں تشبیہات واستعارات، رمز و کنائے اور علائم کی اپنی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے چونکہ اُن کے بہت گہرے معانی ہوتے ہیں بقول ڈاکٹر نذیر آزاد:

''رُوبینہ میر نے پیچیدہ علامتوں اور استعاروں جن کے معنی بہت گہرے ہوتے ہیں اور بہت غور وفکر کے بعد کھلتے ہیں سے عمومی طور پر گریز کیا ہے''

حاصل مطالعہ یہ ہے کہ رُوبینہ میر کا شعری سفر ارتقاء پذیر ہے۔ اُنہیں ابھی بہت دور جانا ہے۔ اُن

کے شعری ذوق وشوق میں اُن کی مسلسل مشقِ سخن سے اور زیادہ نکھار پیدا ہوگا، اُردو ادبی وشعری حلقوں میں وہ اپنی غزلوں اور آزاد نظموں کے باعث خاصی متعارف اور مقبول ہو رہی ہیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ رُوبینہ میر کا شعری سفر اگر اسی پاکیزہ ذوق وشوق کے ساتھ جاری رہا تو وہ دِن دُور نہیں جب وہ نسائی شاعری میں ایک منفرد اور اہم دستخط قرار پائیں گی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

لین نمبر ۳، مکان نمبر ۷

فردوس آباد، سنجواں جموں توی

رُوبینہ میر (ایک تأثر)

راجوری پونچھ علاقہ ماضی میں ادبی روایات کا مسکن رہا ہے خوش بختی سے میں چند برس پہلے دو سال کے لئے راجوری میں مقیم رہا۔ اور اس دوران بود و باش کرنے والے کئی نامور اور معتبر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے ذاتی مراسم پیدا کرنے کی سعادت حاصل کر پایا۔ محترم فاروق مظفر صاحب، شہباز راجوروی صاحب، فدا راجوروی صاحب اور دیگر اصحابِ سخن کے ساتھ جمی محفلیں یاد آ رہی ہیں۔ بزرگ شعراء، ادباء حضرات کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں نوجوان شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی ایک خاصی جماعت بھی سرگرم تھی اور ان کے ساتھ بھی اٹھنے بیٹھنے، سننے سُنانے کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ شاعری اور خاص کر اردو شاعری کے حوالے سے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ پیر پنچال علاقے میں اس کا ایک منفرد دبستان اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے اور اُردو کے ملکی اور عالمی منظر نامے پر اپنا وجود منوانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ کئی نسبتاً نئی آوازیں مقبول بھی ہیں اور قلیل عرصے میں مشہور بھی ہوئی ہیں۔ رُوبینہ میر سے میں واقف نہیں، میں نے اس زمانے میں ان کا نام گرامی نہیں سُنا۔ ہاں ان کے لائق و فائق برادر، صحافی اور اب سیاست دان شفیق میر کے ساتھ میرے خاصے اچھے مراسم تھے اور اب بھی ہیں۔ رُوبینہ میر کو میں نے حال ہی میں ایک آدھ مشاعرے میں سُنا۔ اُن کی پہلی تصنیف ''آئینۂ خیال'' (2013) بھی انہوں نے از راہِ کرم حال ہی میں مجھے ارسال فرمائی ہے۔ ہاں مگر اس خاتون شاعرہ کو میں متواتر ریاستی اخبارات کے ادبی صفحات پر دیکھتا رہا۔ غزل کے حوالے سے ان کی کاوشیں کئی بار متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اور خواہش تھی کہ ریاست کی اس ابھرتی آواز کو بھرپور طریقے سے سُنا جائے۔ اور اس کا موقع خود از راہِ مروت رُوبینہ میر نے اس حکم کے ساتھ فراہم کیا کہ یہ ناچیز ان کے کلام کے دوسرے مجموعے ''تفسیر حیات'' کے لئے اپنی کچھ نہ کچھ اناپ شناپ تحریر کرے۔

میں نے ان کا یہ آنے والا مجموعہ جستہ جستہ دیکھا ہے۔ان کی غزلوں کا اپنا منفرد لہجہ ہے، عموماً ایک روانی ہے جو قاری کو بہا لے جاتی ہے، ان کے موضوعات زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات پر مبنی ہیں اور اپنے احساسات کو وہ خوبصورت الفاظ کا سہارہ لے کر پیش کرتی ہیں، ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ شاعر کو اپنے موضوعات کو اپنے معیار کی کسوٹی پر پرکھ لینا چاہئے، یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ایک احساس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے ایک خصوصی حیثیت اور حسیّت کی شاعری تخلیق کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔

رُوبینہ میر کی غزلوں سے درجنوں ایسے اشعار کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو اس خصوصی زمرے میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ چند ہی اشعار بطور مثال درج کر رہا ہوں:

ایسا کرنا نہیں عبادت سے کم
فرض جو بھی ہو اپنا ادا کیجئے

☆

میری نظریں دستکیں دیتی رہیں
جب بھی اس کا بند دروزہ ہوا

☆

وہ یقیناً سدھر گئے ہوتے
میرا کہنا جو کر گئے ہوتے

☆

کئی خواب ہم کو دکھاتے رہے ہیں
کہ ہم ان کی باتوں میں آتے رہے ہیں

☆

میں زندگی میں پھر کبھی نہ اُڑ سکی کسی طرح
جو کاٹ اُس نے پر دیئے مذاق ہی مذاق میں

☆

کتنی خوشیاں ملی ہیں کتنے غم
ہم کو سارے حساب آتے ہیں

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ رُوبینہ میر کا یہ مجموعہ ہمارے اُردو شاعری کے خزانے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ اور اس مجموعے کے شاعر کو اپنی شعری شناخت دلوانے میں کامیاب ثابت ہوگا۔

میر ایاز رسول نازکی

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

مطابق ۹ جولائی ۲۰۱۴ء

قارِئین______

آئینۂ خیال تین سال قبل آپ کے روبرو ہوئی______

یہ آپ کی پذیرائی کا نتیجہ ہے_____یا پھر دعاؤں کا ثمر؟______

یہ آپ جانتے ہیں______میں تو صرف اِتنا جانتی ہوں______

کہ آپ کی پذیرائی سے__________نِسوانی جذبات واحساسات کی

شاعری کے باب میں ایک کتاب کا اضافہ ہو گیا______________

آپ کی پذیرائی سے______آج تفسیرِ حیات______آپ کے ساتھ

دِل کی بات کرنے کے لئے________اپنی تمام تر__________حِسّی، سمعی

اور بصری قوت کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہے_____اتنا ہی نہیں بلکہ______

آپ کی پذیرائی سے_____''حرفِ راز''_____''ادھورے خواب''______

آپ کی روح کی ضیافت بننے کو_______بیقرار ہیں__________

اِس پذیرائی کے لئے ___ مشکور وممنون!

رُوبینہ میر

دِسمبر ۲۰۱۵ء

راجوری، جموں وکشمیر

"دُعا"

ہر اِک دَرد کو دے شفا میرے مولا
ہے تجھ سے یہ میری دُعا میرے مولا

ہر اِک مصیبت کو میں جھیل پاؤں
میرے عزم کو دے جِلا میرے مولا

مِلے مجھ کو منزل یہ ممکن نہیں ہے
نہ جب تک ہو تیری رضا میرے مولا

راہِ زندگی میں کئی پیچ و خم ہیں
مجھے سیدھا رستہ دِکھا میرے مولا

خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے برابر
بخش دے میری ہر خطا میرے مولا

کہے تو کِسے حال دل کا رُوبینہ
نہیں کوئی تیرے سِوا میرے مولا
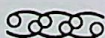
"آرزو"

گُلستاں کو بہار دے یا رب
ہر کلی کو نکھار دے یا رب

ہر طرف مشکلوں کی ہے یلغار
میری قسمت سنوار دے یا رب

گذرے ہیں بے قراریوں سے ہم
اب تو قدرے قرار دے یا رب

میں بھی دیکھوں کہ زندگی کیا ہے
موسمِ خوش گوار دے یا رب

جائزہ لے سکوں میں خود اپنا
دل پہ کچھ اختیار دے یا رب

تجھ سے رُوبینہؔ کی گذارش ہے
سب کے دل کو قرار دے یا رب

غزل

مقدر کی ہم آزمائش کریں گے
جو ممکن نہیں اُس کی خواہش کریں گے

ہمیں مال و زر سے نہیں کوئی رغبت
نہ اس کی کبھی ہم نمائش کریں گے

ہیں اپنی سفارش کے محتاج خود جو
وہ میرے لئے کیا سفارش کریں گے

میں سمجھوں گی دُنیا میں با ذوق ہیں وہ
جو میرے سخن کی ستائش کریں گے

یقیناً اُنہیں مُنہ کی کھانا پڑے گی
وہ میرے لئے جب بھی سازش کریں گے

غلط کو غلط ہی کہیں گے رُوبینہؔ
نہ ہم اس کی ہرگز ستائش کریں گے

رُوبینہؔ جنم سے ہی درویش خو ہیں
کِسی جھونپڑی میں رہائش کریں گے

غزل

نہیں اس کا مسکن جہاں ڈھونڈتے ہیں
سکوں دِل کا ہم بھی کہاں ڈھونڈتے ہیں؟

نہیں ڈالیاں تک بھی باقی شجر کی
یہ پنچھی ٹھکانہ کہاں ڈھونڈتے ہیں

نہیں ہم کو گھیرے ہوئے اِک مصائب
یہاں اور بھی اِمتحاں ڈھونڈتے ہیں

کٹی زندگی اِن پریشانیوں میں
کرائے کا ہر دِن مکاں ڈھونڈتے ہیں

سُکوں وہ ملے گا کسی جھونپڑی میں
جسے محلوں کے درمیاں ڈھونڈتے ہیں

رُوبینہ جو محفوظ برق و شرر ہو
ہم ایسا کوئی آشیاں ڈھونڈتے ہیں

غزل

اُلجھنوں کی بھیڑ میں جب بے طرح ہم کھو گئے
ایک بچے کی طرح پھر بلبلا کر رو گئے

ایسے میں جھوٹے دِلاسے ماں کے کام آتے نہیں
تنگ آئے بھوک سے اِتنے کے بچے سو گئے

اس میں کیا ترمیم ہو قدرت کا یہ دستور ہے
وہ کبھی نہ آ سکے ہیں پھر پلٹ کر ، جو گئے

زندگی میں دیکھ پاتے کاش وہ اُن کی بہار
گلستاں میں بیج پھولوں کے ہیں جو بھی بو گئے

زندگی میں جس میں بھی پائے ہیں اِخلاص و وفا
پل بھر میں ہم دل و جاں سے اُسی کے ہو گئے

ہم بھی ہیں انسان آخر ہم میں بھی احساس ہے
جس کو بھی دیکھا پریشاں ہم پریشاں ہو گئے

کیا کہیں رُوبینہؔ اُن کو دیکھ کر ایسا لگا
اِک خیالی خُلد میں جیسے کہ ہم ہوں کھو گئے

غزل

میں نے اپنے دل پہ پتھر رکھ دیا
رہگذر کا نام جب گھر رکھ دیا

آسماں نے بانٹے ہیں دُنیا میں سُکھ
درد سب کا میرے اندر رکھ دیا

اُس سے اُمیدِ وفا پھر کیا کریں
نام جس کا ہو سِتم گر رکھ دِیا

ہم پہاڑوں سے بھی ٹکرائے مگر
توڑ کر خود اپنا ہی سر رکھ دیا

بجلیوں کا اپنا پن تو دیکھئے
پھونک کر ہے میرا ہی گھر رکھ دیا

اُس کے سر تھا جو کوئی الزام بھی
کیا کہوں سب کچھ مرے سر رکھ دیا

ہم نے رُوبینہ برائے زندگی
آستاں پر اُس کے یہ سر رکھ دیا

غزل

جنوں میں خود پہ تُم قابو جو پاؤ گے تو اچھا ہے
کسی انجان رستے پر نہ جاؤ گے تو اچھا ہے

کرائے کے ان عالیشان محلوں سے ہے یہ بہتر
تُم اپنے جھونپڑوں کو ہی سجاؤ گے تو اچھا ہے

یقیناً اس سے حاصل دل کو کچھ تسکین ہوتی ہے
وفورِ دَرد میں آنسو بہاؤ گے تو اچھا ہے

تلاشِ رِزق میں کچھ ٹھوکریں بھی کھانا پڑتی ہیں
مگر گھر شام سے پہلے ہی آؤ گے تو اچھا ہے

یقیں ہوگا کہ مجھ کو بھی ہے کوئی چاہنے والا
کبھی اُس کا کوئی پیغام لاؤ گے تو اچھا ہے

نہ ہرگز کہہ سکے گا ایسے میں پھر بے وفا تُم کو
کرو گے وعدہ جو اُس کو نبھاؤ گے تو اچھا ہے

بہت سے سننے والوں سے ملے گی داد رُوبینہؔ
کلام اپنا جو محفل میں سُناؤ گے تو اچھا ہے

غزل

مجھ کو کب معلوم تھا کہ حادثہ ہو جائے گا
دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو جائے گا ؟

میں نے سوچا بھی نہ تھا میں ڈھونڈتے رہ جاؤں گی
خواہشوں کی بھیڑ میں دل لاپتہ ہو جائے گا

جب پڑے گی چوٹ غم کی اتنا تو ہو گا ضرور
دل محبت سے بخوبی آشنا ہو جائے گا

مُسکرا کر دیکھنا اُس کا بھی تھا اک معجزہ
اس سے لیکن درمیاں میں فاصلہ ہو جائے گا

ذہن میں میرے خیال آتا رہا ہے بارہا
آئے گا وہ وقت جب انساں خدا ہو جائے گا

ایسا بھی ہو گا کبھی رُوبینہؔ راہِ شوق میں
جس سے اُمیدِ وفا ہے بے وفا ہو جائے گا

غزل

دور تک بھی نہ کچھ نظر آیا
دُھند میں جب بھی اُس کا گھر آیا

جب بھی یاد آئی مجھ کو ماضی کی
ساتھ آنکھوں کے دل بھی بھر آیا

اُس کی بُنیاد ہی نہ تھی کوئی
جو بھی اِلزام میرے سر آیا

کچھ عجب سی ادائیں تھیں اُس کی
کیا کہوں مجھ کو کیا نظر آیا

زندگی میں رہی نہ کوئی کشش
جب میرے دل کا زخم بھر آیا

ہو گئی چُپ سی میں بھی رُوبینہؔ
میری باتوں میں جب اثر آیا

غزل

کاغذی پھولوں سے گلشن کو سجانا ہے محال
پُر کشش اس کو نگاہوں میں بنانا ہے محال

دوسروں سے بچ بھی جائیں ہم بُرے اعمال سے
اُس کی نظروں سے مگر خود کو بچانا ہے محال

میں نے اس کو بھولنے کی کتنی کوشش کی مگر
کیا بتاؤں یادِ ماضی کو بھُلانا ہے محال

میں کہ حق کے راستے پر گامزن ہوں صُبح و شام
سوے باطل اب کسی صورت بھی جانا ہے محال

جس میں رُوبینہؔ کسی انسان کی تحقیر ہو
ایسے منظر اپنی آنکھوں میں بسانا ہے محال

جبر و استبدادِ یزیدی ہو کہ ظلمِ فرعون
راہِ حق سے اہلِ ایماں کو ہٹانا ہے محال
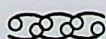
غزل

جو نبھے اقرار ہونا چاہئے
انسان کا کردار ہونا چاہئے

جس میں ہم سستائیں تپتی دھوپ میں
سایۂ دیوار ہونا چاہئے

بات جو بھی روح کو تکلیف دے
اُس سے تو اِنکار ہونا چاہئے

اِس سے مِلتی ہے زمانے کی خبر
اِس لئے اخبار ہونا چاہئے

رازِ دِل ہم کر سکیں جِس پر عیاں
کوئی تو غم خوار ہونا چاہئے

کیوں امیرِ شہر کے محتاج ہوں ؟
اپنا اِک گھر بار ہونا چاہئے

جس میں رُوبینہ نہ کھوئے حق کوئی
ایسا کاروبار ہونا چاہئے

غزل

کئی خواب ہم کو دِکھاتے رہے ہیں
کہ ہم اُن کی باتوں میں آتے رہے ہیں

اُنہیں دِل سے ہم آزماتے رہے ہیں
مگر مات پر مات کھاتے رہے ہیں

ہم اُن کے چھلاوے میں آتے رہے ہیں
کہ دانستہ ہم ڈگمگاتے رہے ہیں

اُنہوں نے مٹایا ہے نفرت کو یکسَر
جو شمعِ محبت جلاتے رہے ہیں

یہ الگ بات تو نے توجہ نہیں دی
تیری بزم میں ہم بھی جاتے رہے ہیں

ہوئے مشکلوں سے جو دُنیا سے قائم
وہ رشتے کبھی ٹوٹ جاتے رہے ہیں

کئی بار برہم ہوئے ہیں رُوبینہ
کئی بار وہ مان جاتے رہے ہیں

"تذَبذُب"

اگرچہ
ویسا کچھ نہیں۔۔۔؟

جیسا۔۔۔
کہ میں سوچ رہی تھی۔۔۔!

ہاں
مگر
ایسا کچھ نہیں۔۔۔؟
جیسا
کہ آپ سوچ رہے ہو۔!

☆

''مذمت''

ایک بار نہیں
بلکہ بار بار آؤں گی میں
تمہارے پاس
جب ہونگے تم اکیلے تنہائی میں
کوئی نہ ہوگا تمہارے پاس
دہراؤں گی ماضی کا اِک اِک پل
کھو جاؤ گے تم
کچھ دیر کے لئے (خیالوں کی دنیا میں)
تڑپاؤں گی میں تمہیں
بن پانی کے مچھلی کی طرح
کوسو گے تم اپنے آپ کو
جب تمہیں ہو جائے گا احساس
اپنی غلطی کا
مگر کر نہ سکو گے مجھ سے اظہار

معافی مانگنا بھی چاہو گے
مگر
مانگ نہ پاؤ گے
کیونکہ وہ میں نہ ہوں گی تمہارے پاس
بلکہ ہوگی
میری یاد
☆

غزل

شجر وہ کیسے سنبھلا ہوگا
جب بھی موسم بدلا ہوگا

ٹوٹی کشتی دیکھ کے ساحل
من ہی من میں رویا ہو گا

دُنیا ہے اِک یاس کا صحرا
دیر سے وہ یہ سمجھا ہو گا

پاؤں میں جو موچ ہے آئی
ظاہر ہے یہ پھسلا ہو گا

ہر اِک شے تھی دُھند میں ڈوبی
دُور دُور تک کُہرا ہو گا

روبینہ یاد تو آئی ہو گی
گھر جب اُس نے بدلا ہو گا

ریزہ ریزہ ہو کے ٹوٹا
پتھر تھا کہاں پگھلا ہو گا -- ؟

سورج کا تھا اُس پر پہرہ -- !
چاند کہاں پھر نِکلا ہو گا - ؟

غزل

ہوئیں مدتیں مسکرائے ہوئے
کہ ہم ہیں غموں کو چھُپائے ہوئے

اُسے شاید اس کی خبر تک نہیں
کہ ہم اُس سے ہیں لو لگائے ہوئے

چلی جب بھی آندھی اُڑا لے گئی
گھروندے تھے جتنے بنائے ہوئے

دئے تو نے دھوکے ہمیں زندگی!
تجھے کب سے ہیں آزمائے ہوئے

کٹی عمر اپنی مگر آج بھی
چراغِ وفا ہوں جلائے ہوئے

نہ ہم جان پائیں گے دُنیا کو اب
ہے چہرے پہ غازا لگائے ہوئے

رُوبینہؔ اُنہیں دیکھ کر یہ لگا
کوئی چوٹ دِل پر ہیں کھائے ہوئے
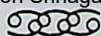
غزل

جو اپنی زندگی میں انا کے قریب ہے
میری نگاہ میں وہ بڑا بدنصیب ہے

بیٹوں کے گھر میں ماں ہے ملازم کے طور پر
اِس دَور میں یہ بات بڑی ہی عجیب ہے

جمہوریت کا فیض ہے یہ اور کچھ نہیں
حق گو ہے زندگی میں جو وقفِ صلیب ہے

خدمت جو کوئی کرتا نہیں والدین کی
وہ شخص زندگی میں بڑا بدنصیب ہے

وہ دُشمنی تو پالتا ہے یہ بھی کم نہیں
دعویٰ ہے اُس کا میرے اس دل کے قریب ہے

رُوبینہؔ مشکلات میں آتا ہے کام جو
یہ کم نہیں کہ اُس کا بھی کوئی حبیب ہے
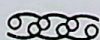
''جھٹکا''

ایک ہی پَل میں
ٹوٹ کر۔۔۔
ہو گیا چُور، چُور
وہ۔۔(میرے خوابوں کا)
''تاج محل''
جب مجھے لگا
''جھٹکا''

''تو ہی ہے''

جو مجھ سے بے پناہ پیار کرتا ہے
باوجود
میری خطاؤں کے۔۔۔
تو ہی ہے
جو پردہ ڈالتا ہے میرے عیبوں پر
باوجود اِس کے۔۔۔
کہ تو سب دیکھتا اور سُنتا ہے
تو ہی ہے
جو مجھ کو روزی دیتا ہے
باوجود میری ناشکری کے
تو ہی ہے
جو کبھی جتاتا نہیں احسان
باوجود اَن گِنت نعمتیں عطا کر کے
تو ہی ہے
جو بدلتا ہے خوشی میں میرے ہر غم کو
باوجود یہ جاننے کے
کہ میں تیری رحمت سے نااُمید ہوں

تو ہی ہے
جو مجھے جینے کا حوصلہ دیتا ہے
باوجود یہ جاننے کے
کہ زندگی مجھ سے جینے کے راستے چھین رہی ہے

تو ہی ہے
جو درگذر کرتا ہے میری ہر خطا کو
باوجود اس کے
کہ تو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے

تو ہی ہے
یارب العالمین
"تو ہی ہے"

☆

غزل

ہو گئی ہم سے کیا خطا ایسی
جس کی پائی ہے یہ سزا ایسی

ہر کسی کی سمجھ سے باہر ہے
دُنیا میں چل پڑی ہوا ایسی

پیش خیمہ تھے جن کے جورُو جفا
وہ کہ کرتے رہے وفا ایسی

کام لیتے رہے حقیقت سے
کی خطا ہم نے بارہا ایسی

اب خلوص و وفا کا دَور کہاں
نفرتوں کی چلی ہوا ایسی

جو محبت سے پُر ہو رُوبینہؔ
کون دیتا ہے اب صدا ایسی

''تماشائی''

ہورہا ہے
ہماری آنکھوں کے سامنے
انسانیت کا قتل۔۔۔!
اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔!

ہورہی ہے
زخموں پہ نمک پاشی۔۔۔
اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔

ہورہا ہے
اِنصاف کا قتل۔۔۔!
اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔

رنگے جارہے ہیں ہاتھ
معصوموں کے خون سے
اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔

ہورہا ہے عام۔۔۔
سُود، شراب نوشی، بے راہ روی، عُریانیت
اور ہم ہیں تماشائی۔۔۔!

کھیل رہے ہیں
ہمارے ارمانوں سے
سیاسی بازی گر۔۔۔
اور ہم ہیں
''تماشائی''

☆

غزل

تو ہندو بن کے جی نہ مسلمان بن کے جی
جینا ہے زندگی میں تو اِنسان بن کے جی

جس پر جہاں کو رشک ہو وہ شان بن کے جی
اس زندگی میں حق کی اک پہچان بن کے جی

ہے چار دن کی زندگی بس اتنا جان لے
تو چند روز کا یہاں مہمان بن کے جی

ایسا لگے کہ تجھ کو کوئی بھی خبر نہیں
دُنیا کی بات بات سے انجان بن کے جی

رُوبینہؔ مسکرا کے مصائب کو ٹال دے
لیکن نہ زندگی سے پریشان بن کے جی

''درد کا احساس''

کاش! تُم نے بھی۔۔۔

میری طرح۔۔۔

خواہشوں کو دفنایا ہوتا۔۔۔

دَرد کا عذاب

سینے سے لگایا ہوتا

وادیٔ دِل میں چیخوں کو

دبایا ہوتا۔۔۔

ناکام حسرتوں کا جنازہ

اپنے کندھے پہ اُٹھایا ہوتا

درد سے تھرتھراتے بدن کو

دُنیا کی نظروں سے چھُپایا ہوتا

تُم نے بھی

تشنگی کی دھیمی دھیمی آنچ میں

خود کو جلایا ہوتا

شاید۔۔۔

تمہیں بھی ہو جاتا۔۔۔

میرے

''درد کا احساس''

غزل

بے رُخی ہی بے رُخی ہے ہر طرف
بکھری بکھری زندگی ہے ہر طرف

دُشمنی ہی دُشمنی ہے ہر طرف
آگ نفرت کی لگی ہے ہر طرف

کِس نے یہ جینا اجیرن کر دیا۔؟
خوف ، دہشت ، سنسنی ہے ہر طرف

کوئی شے بھی اب نہیں ہے مشرقی
رنگ اس کا مغربی ہے ہر طرف

بات جو دِل میں ہے کہہ سکتے نہیں
کتنی اپنی بے بسی ہے ہر طرف

آدمی میں آدمیّت تک نہیں
بات اچھی کون سی ہے ہر طرف؟

اِس میں رُوبینہؔ نہیں ہے فکر و فن
کیا کہیں کیا شاعری ہے ہر طرف؟

غزل

غم زدہ دل ہوا آج کے دَور میں
جینا مشکل ہوا آج کے دَور میں

سازشِ غیر کا کیا کروں میں گِلہ
بھائی شامل ہوا آج کے دَور میں

جس کو رہبر سمجھتا رہا قافلہ
وہی قاتل ہوا آج کے دَور میں

سخت حیرت ہے اِنسان اِنسان سے
کِتنا غافل ہوا آج کے دَور میں

ایسے ماحول میں لے سکیں سانس ہم
سخت مشکل ہوا آج کے دَور میں

ایسی باتوں کا ہوتا نہیں ہے یقیں
طوفاں ساحل ہوا آج کے دَور میں

لب پہ آتا ہے رُوبینہؔ جو ماجرا
کہنا مشکل ہوا آج کے دَور میں

غزل

اس دُنیا کا حال نہ پوچھ
چلتی ہے کیا چال نہ پوچھ

راس مجھے بھی آ نہ سکا
مجھ سے میرا خیال نہ پوچھ

ساری عمر کٹی مشکل میں
اور کوئی بھی سوال نہ پوچھ

ہم نے اکثر کاٹے ہیں
کیسے۔۔۔؟ ماہ و سال نہ پوچھ

مچھلی کو معلوم نہ تھا
پانی میں تھا جال نہ پوچھ

رُوبینہؔ ملنے پہ اُسے
دِل کا ہوا کیا حال نہ پوچھ

غزل

وہ یقیناً سُدھر گئے ہوتے
میرا کہنا جو کر گئے ہوتے

بات کرتے وہ مسکرا کے اگر
میرے دِل میں اُتر گئے ہوتے

وہ گزرتے اگر مسائل سے
سارے نشے اتر گئے ہوتے

کام لیتے نہ حوصلے سے اگر
ہم کہ جیتے جی مر گئے ہوتے

آپ آتے جو گلستاں میں کبھی
پھول کھِل کر نکھر گئے ہوتے

کاش تھوڑی سی روشنی کے لئے
چاند تارے بکھر گئے ہوتے

یہ کرم ہی وہ کرتے رُوبینہ
خواب آنکھوں میں بھر گئے ہوتے

صنفِ نازک

زباں رکھتی ہوں میں بھی مُنہ میں اَپنے اے زباں والو
مجھے کمزور مت سمجھو کسی صورت جہاں والو

میں ایسی برف کی سِل ہوں پگھل سکتی بھی ہوں پل میں
پہاڑوں کو اگر چاہوں نِگل سکتی بھی ہوں پل میں

ارے او ناسمجھ تجھ کو ہے کیا اس کا بھی اندازہ
جہانِ زندگی کے گھر کا بس اک میں ہوں دروازہ

کبھی تُو کر نہیں سکتا مجھے جو کام بخشا ہے
مجھے انسان کی تخلیق کا اِنعام بخشا ہے

حقیقت ہے مرے اِن قدموں کے نیچے ہی جنت ہے
اسی جنت کی گہرائی میں دُنیا بھر کی راحت ہے

بطن سے میرے تو پھُوٹا ہے خود پر ناز کرتا ہے
مرے ہی سامنے چلاّ تا ہے آواز کرتا ہے

جہاں والوں نے ہر پل امتحاں میں مجھ کو ڈالا ہے
ہزاروں مشکلیں سہہ کر بھی میں نے تجھ کو پالا ہے

جہاں میں میرے ہی دم سے ترا یہ بول بالا ہے
تیری اِس بے حِسی نے مجھ کو تو حیرت میں ڈالا ہے

غزل

ایسا لگتا ہے کسی شے کی کمی ہے ہر طرف
زندگی کی ہر ادا میں بے بسی ہے ہر طرف

ہر کوئی اب جلتا رہتا ہے حسد کی آگ میں
دوسروں کی ہر خوشی پر خامشی ہے ہر طرف

سانس لینے پر چُبھن محسوس ہوتی ہے مدام
کیا کہیں کیسی ہوا یہ چل رہی ہے ہر طرف

کچھ نہیں آتا سمجھ میں کیسے منظر ہیں یہاں
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں نمی ہے ہر طرف

زندگی جینا ہے مُشکل اور مرنا سہل ہے
زِندگی خود حال اپنا کہہ رہی ہے ہر طرف

کیا کیوں رُو بینہ دِل ہیں غم میں سب ڈوبے ہوئے
اور چہروں پر برابر بے بسی ہے ہر طرف

غزل

مفہوم جو تھا بات کا وہ جان تو گئے
صد شکر اُن کی جو تھی خطا مان تو گئے

کچھ بھی زبان سے نہ کہا جو اور بات ہے
اتنا بہت ہے وہ مجھے پہچان تو گئے

اُس نے جو کر دیا ہے زمانے سے تذکرہ
جو بھی کئے تھے ہم پہ وہ احسان تو گئے

وہ آئندہ نہ توڑیں گے ہرگز کسی کا دِل
بس اِتنی آرزو تھی مری مان تو گئے

رُوٹھی ہوئی سی رہتی ہے ہم سے یہ ہر گھڑی
انداز زندگی کے ہم پہچان تو گئے

رُوبینہ مختلف سا ہے ان کا سلوک اب
میرے لئے بہت ہے مجھے مان تو گئے

''ماں''

جب مصیبت میں دُعا دیتی ہے ماں
دِل سے ہر اِک غم بھلا دیتی ہے ماں

بچوں سے ہوتے ہیں جتنے جُرم بھی
سارے اپنے سر لگا دیتی ہے ماں

گھر میں پیدا ہوتے ہیں جو بارہا
ایسے سب جھگڑے مٹا دیتی ہے ماں

جب اُجڑ جائے کبھی دِل کا چمن
اس کو اک پل میں بسا دیتی ہے ماں

زندگی ہر غم سے ٹکرا سکتی ہے
حوصلہ اِتنا بڑھا دیتی ہے ماں

کام آئے بچوں کے جو عمر بھر
اپنے دل سے وہ دعا دیتی ہے ماں

کوئی پوچھے مجھ سے رُوبینہؔ اگر
کیا بتاؤں میں کہ کیا دیتی ہے ماں؟

غزل

باتوں باتوں میں ہی کہہ کیا سے کیا دیتے ہیں لوگ
اچھے خاصے دانا کو پاگل بنا دیتے ہیں لوگ

اس لئے بھی کٹتی ہے تاریکیوں میں زندگی
شمعِ اِخلاص و وفا اکثر بُجھا دیتے ہیں لوگ

ہر گھڑی ملتے ہیں ان کی ذات سے مکر و فریب
کیا بتائیں کیا محبت کا صِلہ دیتے ہیں لوگ

ہم جنہیں کہہ سکتے ہیں جن کو یہ سنگِ میل ہیں
راستے سے وہ نقوشِ پا مٹا دیتے ہیں لوگ

احتراماً ہم کبھی انکار کر سکتے نہیں
بارہا بے جُرم بھی ہم کو سزا دیتے ہیں لوگ

ہم نے خود دیکھا ہے رُوبینہ نہیں ہے شک کوئی
دُنیا میں ہر بات کو اکثر ہوا دیتے ہیں لوگ

”بھیانک رات“

جب
کالے بادلوں کے پیچھے
چھُپ گیا چاند۔۔۔۔
ستارے بھی
ایک ایک کر کے
ڈوب گئے۔۔۔!
اچانک
بستی پر
اندھیرا چھا گیا۔۔۔
ڈسنے لگا اندھیرا۔۔۔
سانپ کی طرح۔۔۔
میں بے طرح گھبرا گئی۔
کیونکہ
اس سے پہلے
میں نے
کبھی نہ دیکھی تھی
ایسی
”بھیانک رات“

غزل

وہ رازِ دل چھپائے جا رہے ہیں
سِتم یہ ہم پہ ڈھائے جا رہے ہیں

رُوبینہؔ ایک دن ہوں گے وہ نادم
ہمیں ناحق ستائے جا رہے ہیں

ہمیں معلوم ہیں سب اُن کی چالیں
عبث پاگل بنائے جا رہے ہیں

گریباں میں وہ اپنے جھانک لیتے
ہنسی کِس کی اُڑائے جا رہے ہیں

کبھی فُرصت میں آ کر دیکھ جاتے
وہ جو چوٹیں لگائے جا رہے ہیں

رُوبینہؔ وہ جو لمحے ساتھ گذرے
برابر یاد آئے جا رہے ہیں

غزل

وہ تشنگی کو اور بڑھا کر چلے گئے
ٹھہرے نہ ایک لمحہ بھی آ کر چلے گئے

کیا کیا ادائیں اپنی دکھا کر چلے گئے
دیوانہ اپنا سب کو بنا کر چلے گئے

کرتا رہے گا دیر تک اُنکو زمانہ یاد
رستے میں جو چراغ جلا کر چلے گئے

وہ چاہتے تھے دیکھ نہ پائے کوئی بھی خواب
جو سو رہے تھے اُن کو جگا کر چلے گئے

کھنڈرات کے سوا یہاں کوئی بھی شے نہ تھی
کچھ لوگ اُجڑا شہر بسا کر چلے گئے

ممکن نہیں تھا دیر تک دنیا میں رہتے ہم
افسانہ زندگی کا سُنا کر چلے گئے

رُوبینہؔ اُن کا اہل سیاست سے ربط ہے
آنکھوں میں کتنے خواب سجا کر چلے گئے

''بددُعا''

اتنے دُکھ دے کر بھی ۔۔۔؟
کیا۔۔۔؟
من نہیں بھرا
آپ کا
جو
اب ایسی بددُعا دے رہے ہو
کہ
''اللہ آپ کی عمر دراز کرے''
اس سے بڑھ کر
اور کیا ہو سکتی ہے
''بددُعا''

☆

غزل

یہ کیا اُس نے کر دیا مذاق ہی مذاق میں
کہ توڑ اپنا گھر دیا مذاق ہی مذاق میں

ستم یہ اُس نے کر دیا مذاق ہی مذاق میں
کہ دِل میں زہر بھر دیا مذاق ہی مذاق میں

میں زندگی میں پھر کبھی نہ اُڑ سکی کسی طرح
جو کاٹ اُس نے پَر دیا مذاق ہی مذاق میں

نہ جانے میرے دِل میں ایسی بات کیسے آ گئی۔؟
کہ اُس کو رُسوا کر دیا مذاق ہی مذاق میں

میں زندگی میں اُس کی یہ ادا سمجھ نہیں سکی
جو مجھ کو اِتنا ڈر دیا مذاق ہی مذاق میں

یہ وہ بھی جانتا ہے اس سے میرا ربط تک نہیں
گنہ جو مجھ پر دھر دیا مذاق ہی مذاق میں

رُوبینہ تیرے شعر پھر نہ ہوں گے کیسے پُر اَثر۔؟
جو درد اِتنا بھر دیا مذاق ہی مذاق میں

"بے یقینی"

برسات کی تیز بارش سے
کچے مکانوں کو گرتے دیکھ کر
فکرِ لاحق ہوگئی۔۔۔!
اپنے گھر کی۔۔۔
آئے دِن
زلزلوں کے جھٹکوں سے
جگہ جگہ
دراریں پڑ چکی ہیں
چھت بھی ٹپکے جارہی ہے
ستون۔۔۔
بھلا
کب تک۔۔۔؟
سہارا دے سکتے ہیں
اُن گھروں کو۔۔۔
جو گھر۔۔۔
بنیاد سے ہی ہل گئے ہوں

☆

غزل

کئے ظُلم اُس نے کیا کیا مری زندگی سے پوچھو
یہ داستانِ حسرت میری بے بسی سے پوچھو

اس زندگی کی راہ میں اُس نے قدم قدم پر
دھوکے دئے ہیں کیسے میری سادگی سے پوچھو

دو روزہ زندگی میں خاموش رہ کے اکثر
میں نے سِتم سہے ہیں جو خامشی سے پوچھو

جسے زندگی ہیں کہتے وہ ہے موت سے بَد تَر
مفہوم زندگی کا کبھی مُفلسی سے پوچھو

میری وفاؤں سے بھی وہ مطمئن نہیں ہے
مجھ سے جو چاہتا ہے بس یہ اُسی سے پوچھو

مُدّت ہوئی کہ اُس کے بگڑے ہوئے ہیں تیور
مجھ سے خفا سی ہے کیوں زِندگی سے پوچھو

رُوبینہ میں نے ہرگز سوچا نہ تھا کبھی یہ
بہکے مرے قدم کیوں اسی بے خودی سے پوچھو

''واپس آجاؤ''

سورج
کب کا غروب ہو چکا ہے
شام کب کی ڈھل چکی ہے
اندھیرا ابھی گہرا ہو چکا ہے
اور ایسے میں
تُم اِتنی دُور سے
مجھے آواز دے رہے ہو
کہ
واپس آجاؤ
اب جبکہ
میری اُمیدوں کے
سارے پھول مُرجھا چکے ہیں
حسرتیں دَم توڑ چکی ہیں
کلیاں کھِلنے سے پہلے ہی مُرجھا چکی ہیں
دل کی وادی میں

بُول اُگ چکے ہیں
راستے میں جگہ جگہ کانچ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں
کانٹے ہیں
نوکیلے پتھر ہیں
اِن سب کے اُوپر سے چل کر میں پلٹ آؤں
مگر
کیسے؟

☆

غزل

ہو رہا ہے کیا؟ یہ میری جان میرے شہر میں۔۔۔!!
گھومتے ہیں ہر طرف شیطان میرے شہر میں

سنسنی ، بے آئینی ، رشوت ستانی ، رہ زنی
کس قدر سیاست کے ہیں احسان میرے شہر میں

اِک نہ اِک دھڑکا لگا رہتا ہے دِل میں ہر گھڑی
زندگی جینا نہیں آسان میرے شہر میں

مفلسوں پر ہی مصیبت ٹوٹتی ہے بے پناہ
جب بھی اُٹھتا ہے کوئی طوفان میرے شہر میں

جس طرف بھی دیکھئے یخ بستہ سا ماحول ہے
منجمد ہیں دل کے سب ارمان میرے شہر میں

اور ہر اک شے ملے گی جس سے ہوں اِنساں تباہ
مِل نہ پائیں گے فقط اِنسان میرے شہر میں

کیا کہوں رُوبینہؔ کیسے کٹ رہی ہے زندگی
ہر گھڑی رہتا ہے اِک گھمسان میرے شہر میں

غزل

شعروں میں میرے درد ہے کُل کائنات کا
سمجھو نہ اس کو تم فقط میری ہی ذات کا

اِن کو اُچھالتے ہیں ہم جو بھی ہوں خامیاں
کرتے نہیں ہیں ذِکر کسی کی صِفات کا

اِتنا کہا تھا میں نے جفاؤں سے دُور رہ
شائد بُرا وہ مان گئے میری بات کا

دُنیا میں سارے انساں جب آدم کی نسل ہیں
پھر کس لئے ہے تفرقہ یہ ذات پات کا

ہوتا رہا ہے تبصرہ پھر اس پہ دیر تک
جب ذکر چھڑ گیا کسی ماضی کی بات کا

رُوبینہؔ ذات پات سے ہم دُور ہی سہی
ہر اِک اُٹھاتا فائدہ ہے ذات پات کا

''چڑھتے سورج کو سلام''

مطمئن ہوں

میں۔۔۔

زِندگی میں

اپنی جگہ

اِسلئے۔۔۔

کہ

میں نے کبھی نہ کیا۔۔۔

''چڑھتے سورج کو سلام''

☆

"قلم کا وار"

میں
ظلم کی تیز دھار تلوار کا سامنا کرونگی
قلم سے ---
سماج کے ناسوروں پر
نِشتر کا کام کروں گی
قلم سے ---
نابینا، گونگے، بہرے سماج کو
دیکھنا، بولنا، سُننا سِکھاؤں گی
قلم سے ---
کیونکہ ---؟
قلم کا وار ---
تلوار کے وار سے
زیادہ کاری ہے ---

☆

''التجا''

خدا کے لئے۔۔۔
تُم
بھولے سے بھی۔۔۔
کبھی
مجھے چھونے کی
کوشش نہ کرنا
کیونکہ۔۔۔؟
میں
اِتنی ٹوٹ چکی ہوں۔۔۔!
کہ
بکھر جاؤں گی۔۔۔
☆

''چاند پیکر''

رہ، رہ کے

ستا رہی ہے

جس کی یاد۔۔۔۔!

وہ۔۔۔

خوش مِزاج۔۔۔

خوش اِخلاق۔۔۔

روشن خیال۔۔۔

روشن ضمیر۔۔۔

وفا کا پیکر۔۔۔

وہ۔۔۔

(بات کرنے کا)

مُنفرِد

دِلبرانہ انداز۔۔۔

کانوں میں رس گھولتی آواز

دِلفریب اَدا۔۔۔

مہذب

اور دِل موہ لینے والا اسلوب

تہذیب وشائستگی کا پیکر

سُلجھے دِماغ کا مالک

میرے تصورات کی دنیا کا

کہاں چلا گیا۔۔۔۔؟

وہ

''چاند پیکر''

☆

غزل

طوفان تو ہزار ہیں ساحل نہیں رہا
اس زندگی کا اور کچھ حاصل نہیں رہا

جس سے میں زندگی کی یہ رُوداد کہہ سکوں
اِس دَور میں کہ ایسا بشر مِل نہیں رہا

کیا کہیئے زندگی میں یہ کیسی ہوا چلی
غنچہ کوئی بھی آرزو کا کِھل نہیں رہا

جذبات بھی وہی ہیں ، خیالات بھی وہی
پہلو میں میرے پہلا سا وہ دِل نہیں رہا

طوفاں پہ کس خیال سے اِلزام دیجئے
اپنا سفینہ ہی لبِ ساحل نہیں رہا

رُوبینہؔ میرا دل رہا مصروف بے طرح
لیکن غمِ حیات سے غافل نہیں رہا

"زخمی احساس"

خوب
تشہیر کرتے رہے
تُم
میری اُس غلطی کی
جو کبھی مجھ سے
دانستہ یا غیر دانستہ
سرزد ہوئی۔۔۔
مگر
افسوس۔۔۔!
کہ نظر انداز کرتے رہے
تم
میری اُس خوبی کو
جس کو غیروں نے سراہا
تم ہمیشہ
ڈھونڈتے رہے
میری خامی۔۔۔

میری
ایک لمحے کی غفلت کے یوں منتظر۔۔۔
گویا کوئی شکاری۔۔۔
اپنے شکار کا
یہ پرواہ کیئے بغیر
کہ ہو رہا ہے
میرا
زخمی احساس

☆

غزل

زندگی میں جو کچھ ہے وہ میں دیکھ سکتی ہوں
کون دیکھ پائے گا جو میں دیکھ سکتی ہوں

تجھ سے دور تر ہوں میں پھر بھی مجھ پہ ظاہر ہے
تیرے دل میں پنہاں ہے جو میں دیکھ سکتی ہوں

میرے دل پر افشاں ہے راز ہے جو قدرت کا
مُنہ سے کچھ نہیں کہتی گو میں دیکھ سکتی ہوں

کتنے راز ہیں ایسے دور ہر نظر سے ہیں
وہ بتا نہیں سکتی جو میں دیکھ سکتی ہوں

کیا نہیں ہے پوشیدہ وقت کی ان آنکھوں میں
اہلیت ہے جو مجھ میں سو میں دیکھ سکتی ہوں

مانتی ہوں رُوبینہؔ یہ کرم ہے قدرت کا
کون دیکھ سکتا ہے جو میں دیکھ سکتی ہوں

غزل

یہ ہے نوکیلے خار کا موسم
اب کہاں ہے بہار کا موسم

دُور تک بھی نظر نہیں آتا۔۔۔
سچے قول و قرار کا موسم

کون جانے یہ ختم کب ہوگا۔۔؟
بہار کے انتظار کا موسم

کس قدر دل کو زخم دیتا ہے
گردشِ روزگار کا موسم

کٹ گئی زندگی نہ ختم ہوا
دیدۂ آب دار کا موسم

کچھ بھی ہم کو نظر نہیں آتا
جب ہو گرد و غُبار کا موسم

ہے وقتِ سوچ دل کی رُوبینہ
ہے خزاں بھی بہار کا موسم

پیغام

نفرت کی ظلمتوں کو مِٹاتے چلے چلو
شمع محبتوں کی جلاتے چلے چلو

اتنا رہے خیال قدم ڈگمگا نہ جائیں
منزل کی سمت اِن کو بڑھاتے چلے چلو

ان کے سبب لگیں نہ کسی کو بھی ٹھوکریں
رستے سے پتھروں کو ہٹاتے چلے چلو

مسلم ہو، سکھ ہو، کہ برہمن ہو، اس سے کیا
تم گیت بھائی چارے کے گاتے چلے چلو

نفرت سے بڑھ کے اور کوئی شے بُری نہیں
یہ بات ہر کسی کو بتاتے چلے چلو

منزل تمہیں پکارے گی اک روز اپنے آپ
اُلفت کو اپنی اور بڑھاتے چلے چلو

رُوبینہ کہنہ رستوں میں جو کھو کے رہ گئے
ہیں محوِ خواب اُن کو جگاتے چلے چلو

"اُمید"

ایک
تُم ہی ہو۔۔۔
جو مجھے سہارا دیتی ہو
جینے کا۔۔۔
ورنہ
یہ میری چھوٹی سی دُنیا
کب کی ختم ہو گئی ہوتی
ایک
تم ہی ہو۔۔۔
جو میری ہمت بڑھاتی ہو
اُس وقت
جب میں ہمت ہار چکی ہوتی ہوں
ایک
تُم ہی ہو۔۔۔
جو بچا لیتی ہو
مجھے گرتے، گرتے
تھام کر میرا ہاتھ

ایک تمہارے ہونے سے
میں لڑ سکتی ہوں
دُنیا سے
جیت سکتی ہوں
ہر جنگ۔۔۔
کبھی نہ چھوڑوں کی
میں
تیرا دامن
اے میری
اُمید
☆

غزل

محبت کو رُسوا نہ ہر گز کرو
زمانے میں ایسا نہ ہر گز کرو

نہیں ایک نعمت سے کم زندگی
بسر اس کو تنہا نہ ہر گز کرو

یہ ممکن ہے اُس کی ہوں مجبوریاں
جفاؤں کا شکوہ نہ ہر گز کرو

محبت تقدّس سے بھر پور ہے
محبت کا سودا نہ ہر گز کرو

یہ اُس کی ہے مرضی وہ کیا دے تمہیں
مگر تم تقاضا نہ ہر گز کرو

نہ توڑو کبھی بھول کر کوئی دِل
محبت میں ایسا نہ ہر گز کرو

رُوبینہؔ نے مانا کہ برتر ہو تُم
مگر یہ تماشا نہ ہر گز کرو

”قیمت“

شہر میں جگہ جگہ
تمہاری نیلامی کے
چرچے ہو رہے ہیں
نہ معلوم۔۔۔؟
کہاں تک جائے گی۔۔؟
تمہاری
قیمت

☆

''احساس''

وہ
میرے کس کام کا۔۔۔؟
جو۔۔۔
میرے مرنے کے بعد۔۔۔
ہوگا
تمہیں
''احساس''

☆

غزل

اُسے اپنے دِل میں بسا کر تو دیکھ
جو ہیں دوریاں وہ مٹا کر تو دیکھ

بہت مشکلیں آئیں گی راہ میں
قدم مشکلوں میں بڑھا کر تو دیکھ

نہیں ہے بُرا ہر کوئی زیست میں
اگر ہو سکے آزما کر تو دیکھ

اِسی میں مِلے گا سکونِ حیات
محبت کی دُنیا بسا کر تو دیکھ

بکھرتی رہے جس سے اِک روشنی
کبھی ایسی شمع جلا کر تو دیکھ

تجھے علم ہو گا ہے کیا زندگی
غموں میں کبھی مسکرا کر تو دیکھ

رُوبینہؔ وہاں پر بھی اِنسان ہیں
کبھی جھونپڑوں میں بھی جا کر تو دیکھ

غزل

مصائب میں پیہم سفر کر رہی ہوں
کہ میں جینے کے واسطے مر رہی ہوں

نہ سَرزَد ہوئی ہے خطا کوئی مجھ سے
نہ جانے میں کس بات سے ڈر رہی ہوں

میں خاموش سہتی ہوں ہر جور اُس کا
سمجھ میں نہیں آتا کیا کر رہی ہوں

کوئی جو بھی کرتا ہے مرضی ہے اُس کی
میں خود کو پریشان کیوں کر رہی ہوں

ضروری ہے انسان کا اپنا گھر ہو
پھر کیوں رُوبینہؔ میں بے گھر رہی ہوں

رُوبینہؔ بہت پاس ہے میری منزل
کبھی راستے کا میں پتھر رہی ہوں

غزل

ایسے میں خاک منزلِ مقصود پاؤ گے
جب تک نہ راستے سے تم کانٹے ہٹاؤ گے

پھر دیکھنا ملے گا طبیعت کو کیا سکون؟
جب زندگی میں دوسروں کے کام آؤ گے

مکر و فریب سے جب بھی لو گے کام تُم
ایسے عمل کی ایک دن قیمت چکاؤ گے

سارا کیا کرایا ملا دو گے خاک میں
احسان کر کے دوسروں پر جب جتاؤ گے

احساس ہو گا دوسروں کے اضطراب کا
خود اپنے دِل پر جب بھی کوئی چوٹ کھاؤ گے

ہوتے ہیں زندگی میں کیا معنی خلوص کے
ہم سے ملو گے جب بھی کبھی جان جاؤ گے

رُوبینہ زندگی میں حقائق سے کام لو
کب تک تصورات کی محفل سجاؤ گے

غزل

جو تھے کبھی فرزانوں میں
شامل ہیں دیوانوں میں

دُور ہوئے ہیں حقائق سے
کھوئے ہیں افسانوں میں

چین و سکوں سی چیز کہاں ؟
عالیشان مکانوں میں

حضرتِ واعظ شام ڈھلے
ملتے ہیں میخانوں میں۔۔۔

مہر و وفا سی چیز کوئی
ملتی نہیں دُکانوں میں

اپنی ساری عمر کٹی
اکثر خستہ مکانوں میں

رُوبینہؔ کچھ فرق بتا؟
اپنوں اور بیگانوں میں!

غزل

حقیقت کے ہیں ہم قائل ادا کاری نہیں آتی
ہو کوئی صورتِ حالات مکاّری نہیں آتی

مصائب سینکڑوں ہوں رُو بہ رُو ٹکراتے ہیں اُن سے
زمانہ کچھ کہے لیکن دل آزاری نہیں آتی

غریبوں ہی کے دم سے دُنیا میں بنتی ہیں سرکاریں
غریبوں کو کوئی بھی چیز سرکاری نہیں آتی

وہ جس کی زندگی اوروں کی خِدمت میں گذرتی ہے
کبھی خدمت میں اُس کو کوئی بے زاری نہیں آتی

محبت اپنا شیوہ ہے محبت پر ہیں ہم شیدا
جو ہیں اہلِ محبت اُن کو مکاّری نہیں آتی

جو بکتا رہتا ہے اک اک قدم پر چند سِکّوں میں
کسی صورت بھی اُس کے دِل میں خودداری نہیں آتی

کبھی دھوکا نہیں دیتے زمانے کو وہ رُوبینہ
یہاں جو صاف گو ہیں اُن کو مکاّری نہیں آتی

غزل

ہم اگر اجنبی شہر میں جائیں گے
کیا یقیں ہے کہ دِل کا سکوں پائیں گے

راس آئے نہ آئے وہاں کا چلن؟
چھوڑ کر شہر اپنا ہی پچھتائیں گے۔۔۔!

اس پہ کچھ غور کر اس پہ کچھ سوچ تُو
ہم تری انجمن سے کہاں جائیں گے

کون اپنائے گا غیر کی بزم میں۔۔۔؟
ایسی صورت میں پھر ہم کہاں جائیں گے

ختم ہونے کو ہے زندگی کا سفر۔۔۔
ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس کو تھک جائیں گے

ان سے ٹکرائیں گے کتنی ہوں مشکلیں
یہ غلط ہے کہ ہم مات کھا جائیں گے

ہیں بچھڑنے کو رُوبینہ دونوں مگر
ہم بھی پچھتائیں گے وہ بھی پچھتائیں گے

غزل

کون جانے کس کو ہے اس کی خبر
زندگی کا کیسا گزرے گا سفر

اِک جگہ ٹکتی نہیں میری نظر
ڈھونڈتی ہے خوب سے یہ خوب تر

زندگی کس حال میں ہو گی بسر
فکر رہتی ہے یہی شام و سحر

دُور تک پھیلا ہے اِک گرد و غبار
جاتی ہے میری جہاں تک بھی نظر

اب نہیں ہے ہم کو جس پر اِختیار
رہ گئے ہیں اُس کو ہم بس سوچ کر

ہم کو ایسے میں ہو کیا دُنیا کا خوف
آپ ہیں جب زندگی میں ہم سفر

کیا کہیں رُوبینہ ہم دُنیا کا حال
ہم کو اپنی بھی نہیں کوئی خبر

غزل

ہم کہاں آ گئے آپ کے شہر میں
کتنے گھبرا گئے آپ کے شہر میں

زندگی میں کہیں اور ملتے کہاں۔۔۔؟
راز جو پا گئے آپ کے شہر میں

ایسے منظر نہ دیکھے تھے ہم نے کبھی
ہم کہ شرما گئے آپ کے شہر میں

اُس پہ اکثر ہُوا ہے گماں آپ کا
جس سے ٹکرا گئے آپ کے شہر میں

دِل کو شاید میسر ہو قدرے سکون
اس لئے آ گئے آپ کے شہر میں

جانتے ہی نہیں اِن کو رُوبینہ ہم۔۔۔؟
وہ یہ فرما گئے آپ کے شہر میں۔۔۔!

"کچھ معلوم نہیں"

آخر
تم نے
مجھے
چھوڑ دیا۔۔۔!
تنِ تنہا
لمبی راہ گزر پہ
بھٹکنے کے لئے
بے منزل
چوراہے پر
یہاں سے
کون سا راستہ۔۔۔؟
کہاں کو جاتا ہے۔۔۔؟
کچھ خبر نہیں۔۔۔!
کچھ معلوم نہیں۔۔۔!

☆

غزل

وہ کہ ہوتا ہے حقیقت سے ہمیشہ دُور تر
آدمی جو کچھ کہے جذبات کے زیرِ اثر

زندگی میں رنگ لائی ہے میری ہر آرزو
اُس کی رحمت ہے یہ مجھ پہ کچھ دُعاؤں کا اثر

شاعری میں دیکھئے مجھ کو ہو حاصل کیا مقام
فیصلہ اس بات کا کر لیں گے خود اہلِ نظر

اب نہ وہ جذبات پہلے سے نہ دل کی دھڑکنیں
بے ترے ہیں کس قدر بے کیف یہ شام وسحر

آپ بے شک شوق سے اپنی نگاہیں پھیر لیں
دِل سے لیکن جا نہیں سکتا محبت کا اثر

دِل میں کیا ہے مجھ سے دانستہ کبھی کہتے نہیں
مُسکرا دیتے ہیں رُوبینہ وہ مجھ کو دیکھ کر

غزل

جو غم تھا زندگی میں اُٹھایا خوشی خوشی
ہم نے ہر اک کا ساتھ نبھایا خوشی خوشی

آنکھوں پہ میں نے اُس کو بٹھایا خوشی خوشی
جو بھی کوئی مرے گھر ہے آیا خوشی خوشی

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ با وفا نہیں
ہر بار اُس سے ہاتھ ملایا خوشی خوشی

شامل چراغِ دِل میں مرا اپنا خون تھا
میں نے ہے یہ چراغ جلایا خوشی خوشی

جس نے قدم قدم پہ بکھیری ہیں مشکلیں
اُس کو بھی میں نے دِل سے لگایا خوشی خوشی

رُوبینؔہ مجھ سے کرتا ہے اب مسکرا کے بات
روٹھا ہوا تھا جس کو منایا خوشی خوشی

رُوبینؔہ زندگی ہے کرائے کا اِک مکاں
میں نے ہے اِس کو کتنا سجایا خوشی خوشی

غزل

ہر قدم پر ٹھوکریں کھائے ہوئے ہیں
پھر بھی ہم دُنیا سے ٹکرائے ہوئے ہیں

کچھ نظر آتا نہیں اُن کے سِوا اب
بزم پر وہ اس طرح چھائے ہوئے ہیں

اپنی ہر اِک ہار اُن کی جیت ہے
ہم نہ پا کر بھی اُنہیں پائے ہوئے ہیں

کتنا حاصل ہے سکونِ زندگی
جب سے اُن کی یاد کے سائے ہوئے ہیں

اُن کی نظروں سے تو لگتا ہے مجھے
کچھ نہ کچھ پیغام وہ لائے ہوئے ہیں

مطمئن ہے مجھ سے میری زندگی
اِس کے جو بھی غم ہیں اپنائے ہوئے ہیں

کچھ نہیں رُوبینہؔ ہم اُن کے بغیر
دِل کے اَرمانوں کو دفنائے ہوئے ہیں

''احساسِ ندامت''

اس سے پہلے تو۔۔۔
کبھی ایسا نہیں ہوا
تو پھر۔۔۔
آج یہ اچانک کیا ہوا۔۔۔؟
کہ یہ
''زعفرانی قہوہ''
جو میری طبیعت کو راس نہ آیا
بلکہ
اس سے پہلے بھی
میں پیتا آیا ہوں
مگر
آج یہ۔۔۔؟
ہاں۔۔۔!
یاد آ گیا۔۔۔
اب کی بار میں نے
نمک جو ملا دیا
جبھی تو ایسا ہوا

☆

غزل

سہمے سہمے سے اکثر رہا مت کرو
تُم کسی شے سے ہرگز ڈرا مت کرو

بستی والے کہاں تُم کو اپنائیں گے
حال دِل کا کسی سے کہا مت کرو

کون جانے وہاں کا ہو کیسا چلن
اجنبی شہر میں تُم رہا مت کرو

ان میں پھولوں کی بھی کٹتی ہے زندگی
اس طرح کانٹوں سے تُم ڈرا مت کرو

آدمی آدمی کا ہو دُشمن جہاں
ایسے ماحول میں تُم رہا مت کرو

جس سے شرمندہ ہونا پڑے عمر بھر
زندگی میں تُم ایسی خطا مت کرو

جس سے رُوبینہ دِل کو لگے چوٹ سی
ایسی باتوں کا تُم تذکرہ مت کرو

غزل

نہ ہر بات پر مسکرایا کرو
نہ میری ہنسی یوں اُڑایا کرو

محبت کے یہ بھی تو آداب ہیں
اگر روٹھ جاؤں منایا کرو

نہ کہنے کی مجھ کو ضرورت پڑے
جو دِل میں ہے وہ جان جایا کرو

یقیں کرتی ہوں میں ہر اِک بات پر
قسم میری ہر گز نہ کھایا کرو

مہک اُٹھے جس سے یہ بزمِ ادب
کلام ایسا کوئی سُنایا کرو

رُوبینہ یہ سمجھے کہ اس کے ہو تم
کبھی اس طرح پیش آیا کرو

''احساس''

تعجب ہے۔۔۔!
اتنی سزائیں۔۔۔؟
پانے کے باوجود بھی

نہ ہوا
تُمہیں
اپنی غلطی کا
''احساس''

☆

غزل

اُن کو کسی طرح بھی رُلایا نہ جائے گا
شکوہ کوئی زبان پر لایا نہ جائے گا

بے شک مری زباں پر ہوں کتنی بندشیں
لیکن مرے قلم کو دبایا نہ جائے گا

کِتنی ہوائیں تیز چلیں اس کے باوجود
حق کا چراغ کبھی بھی بجھایا نہ جائے گا

جو اُس کی بے وفائی کے باعث نصیب ہے
دِل سے کبھی یہ داغ مٹایا نہ جائے گا

بہتر یہی ہے بزم میں خاموش میں رہوں
افسانہ زندگی کا سُنایا نہ جائے گا

رُوبینہ میرے حال پر تو مجھ کو چھوڑ دے
میرا یہ بوجھ تجھ سے اٹھایا نہ جائے گا

غزل

مُدتیں گذریں کہ میرا مہرباں ناراض ہے
جب سے وہ ناراض ہے سارا جہاں ناراض ہے

کیا کہوں میں بے ثمر سے ہو گئے سارے شجر
جب سے میرے گلستاں کا باغباں ناراض ہے

وہ کہ جس نے خود بجھائے ہوں محبّت کے چراغ
کس طرح مجھ سے کہے کیوں جانِ جاں ناراض ہے

طے تو کرنا ہی پڑے گا زندگی کا یہ سفر
غم نہیں مجھ کو کہ میرِ کارواں ناراض ہے

میں کہوں کس سے رُوبینہؔ اپنے دل کی داستاں
جانتی ہوں مجھ سے میرا رازداں ناراض ہے

''تعجب ہے''

تُم
اِتنا پاس ہو کے بھی
ہمیں
دیکھ نہیں سکتے۔۔۔
اتنا قریب ہو کے بھی
ہمیں
سُن نہیں سکتے۔۔۔
ہمارے ساتھ رہ کے بھی
ہمیں مِل نہیں سکتے۔۔۔
شاید۔۔۔!
تمہارے پاس
وہ آنکھ نہیں۔۔۔
تمہارے پاس
وہ کان نہیں۔۔۔
تمہارے پاس
وہ دِل نہیں۔۔۔
''تعجب ہے''

☆

دو شعر

میں نے آنکھوں میں رات کاٹی ہے
تو نے میری جو بات کاٹی ہے

اے شبِ غم اب تو چھوڑ پیچھا میرا ---!
عمر تیرے ہی ساتھ کاٹی ہے

غزل

اس کو کسی بھی بات کا ڈر نہیں رہا
انسانیت کا کام کوئی کر نہیں رہا

حیرت سی مجھ کو ہوتی ہے سائے کو دیکھ کر
قد میرا خود بھی میرے برابر نہیں رہا

رہتا ہے اِس لئے بھی پریشان یہ بہت
انسان مشکلوں کا اب خوگر نہیں رہا

مجھ کو بھی اب زمانے سے کوئی گِلہ نہیں
اُمید اِس سے کوئی بھی اب کر نہیں رہا

اِنسان آ سکے گا کہاں راہِ راست پر
جذبہ اگر بُرائی کا ہی مَر نہیں رہا

اِنسان اپنے فرض سے رہتا ہے دُور دُور
جو کرنا چاہئے اُسے وہ کر نہیں رہا

ہر چیز مجھ کو لگتی ہے جیسے پرائی ہو
رُوبینہ میرا گھر بھی مرا گھر نہیں رہا

غزل

نہ قسمت سے کوئی گِلہ ہم کریں گے
ہے جو فرض اپنا ادا ہم کریں گے

وہ کرتے ہیں جو بھی مُبارک ہو اُن کو
مگر اُن سے کچھ تو جُدا ہم کریں گے

میسّر ہو سب کو سکوں زِندگی کا
یہ ہر اِک کی خاطر دُعا ہم کریں گے

نبھایا ہے ہم نے نبھائیں گے وعدہ
وفا ہم نے کی ہے وفا ہم کریں گے

کبھی اُن کے دِل کو کوئی ٹھیس پہنچے
نہ ایسی کوئی بھی خطا ہم کریں گے

وہ کرتے ہیں اکثر ہر اِک جَور ہم پر
ذِکر اِس کا کیوں جا بجا ہم کریں گے

منائیں گے اُن کو یہ طے ہے رُوبینہ
اگر وہ نہ مانے تو کیا ہم کریں گے ؟

شکوہ جوابِ شکوہ

مانا کہ ہم کو قدرے شکایت ہے آپ سے
ایسا نہیں کہ ہم کو عداوت ہے آپ سے

اس بات پر تو بارہا نادم ہوئے ہیں ہم
لڑنا جھگڑنا اپنی جو عادت ہے آپ سے

اُنگلی اُٹھائے کون ہمارے کلام پر
حاصل ہوئی یہ ساری مہارت ہے آپ سے

اس کا زمانے بھر میں کہیں بھی نہیں جواب
میں جانتی ہوں میری جو عزّت ہے آپ سے

خاموش بیٹھے رہتے ہیں کرتے نہیں ہیں بات
اِس انجمن میں یہ بھی اِک جدّت ہے آپ سے

لاتے نہیں کبھی کبھی خاطر میں مجھ کو آپ
کچھ بھی نہیں ذرا سی شکایت ہے آپ سے

بے بات کتنی بار ہی ہو جاتے ہیں خفا
اتنی سی بات ہے جو بغاوت ہے آپ سے

اتنی سی بات کے لئے احسان مند ہیں
اس دل میں ساری درد کی دولت ہے آپ سے

رُوبینہؔ کی یہ زندگی ہے آپ کے سبب
کیسے کہے نہ پھر یہ محبت ہے آپ سے

غزل

ریزہ ریزہ بِکھر گئی ہوں میں
حادثوں سے سنور گئی ہوں میں

میں نہ لاتی کسی کو خاطر میں
اپنے سائے سے ڈر گئی ہوں میں

اُس کی باتیں تھیں یا کہ جادو تھا
اُس کی باتوں پہ مر گئی ہوں میں

زندگی میں تھیں مشکلیں کیا کیا
مُسکرا کر گُذر گئی ہوں میں

سب یہ کہتے ہیں پھر اسے کہئے
ایسی کیا بات کر گئی ہوں میں؟

سوچتی ہوں وہ شاید آ نکلے
جس کی خاطر ٹھہر گئی ہوں میں

جانتی ہوں رُوبینؔہ دُنیا کو
اعتبار اس کا کر گئی ہوں میں

"وجہ"

بے بات ہی
خفا ہونے سے پہلے
پوچھ تو لیتے۔۔۔
ہم سے
وجہ۔۔۔

☆

غزل

مجھ کو تو اُس کی ذات سے اُمید بڑی تھی
افسوس! اُسے اپنی ہی شہرت کی پڑی تھی

مانا کہ اِک چھت کے تلے رہے ہم برسوں
لیکن ہمارے درمیاں دیوار کھڑی تھی

ہم چل رہے تھے منزلِ مقصود کی طرف
لیکن سفر میں حادثوں کی دھوپ کڑی تھی

پھر اس کے بعد عمر بھر نزدیکیاں رہیں
اس زندگی سے جب بھی نظر میری لڑی تھی

مانا بچھڑنا بھی کوئی آسان نہیں تھا
مشکل تھی اس سے اور جو ملنے کی گھڑی تھی

رُوبینہ آ گئی ہیں جو یہ دُوریاں نہ پوچھ
میں اپنے آپ سے کبھی نزدیک بڑی تھی

غزل

مُدّت ہوئی سزا بھی اِس کی وہ پا رہا ہے
پھر کیسے جھوٹ کو وہ سچ میں مِلا رہا ہے

ملتا ہے ہر کسی کو اُس کے کیئے کا بدلہ
اِلزام اس کا پھر کیوں قسمت پہ آ رہا ہے

آنکھوں میں دوسروں کی جھونکی ہے دھول اُس نے
خود سے وہ کیسے نظریں اپنی مِلا رہا ہے

وہ ہے امیرِ شہر اُسے کیا۔۔۔ کسی کا ڈر۔۔؟
پھر کیا ہوا اگر وہ کوٹھے سے آ رہا ہے

شاید کے دیکھنا تھا ایسا بھی وقت ہم نے
انسان آج خود کو شیطاں بنا رہا ہے

یہ ہے کرم خدا کا یہ ہے خدا کی بخشش
اپنی اداؤں سے وہ محفل پہ چھا رہا ہے

رُوبینہؔ ڈیرہ ڈالیں گے پھر سے گھاؤں میں ہم
لگتا ہے وہ زمانہ نزدیک آ رہا ہے

غزل

چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
نیند میری اُڑاتی رہی رات بھر

وہ خیالوں میں آتی رہی رات بھر
کِتنے جلوے دکھاتی رہی رات بھر

دیکھ کر میری تنہائیوں کا سماں
زندگی مسکراتی رہی رات بھر

کیا بتاؤں میرے دِل کی یہ بے بسی
کِتنے آنسو بہاتی رہی رات بھر

کتنے پردوں میں رہ کر بھی اُس کی نظر
میرے دِل کو لبھاتی رہی رات بھر

میں کہوں تو کہوں کیا میری زندگی
مجھ سے نظریں چُراتی رہی رات بھر

آشنا تھی نہ رُوبینہ رستوں سے تُو
اس لئے ڈگمگاتی رہی رات بھر

غزل

کوئی سو غم اُٹھاتا جا رہا ہے
مگر وہ مسکراتا جا رہا ہے

نہیں اب یاد صورت تک بھی اُس کی
جو مجھ کو یاد آتا جا رہا ہے

اُسے معلوم ہے میں با وفا ہوں
وہ پھر بھی آزماتا جا رہا ہے

جو مجھ سے دُور تھا ہر زاویئے سے
مجھے اپنا بناتا جا رہا ہے

کریں ہم کیا یقیں وعدوں کا اُس کے
وہ جھوٹی قسمیں کھاتا جا رہا ہے

کوئی شکوہ نہیں کرتا وہ مجھ سے
مگر آنسو بہاتا جا رہا ہے

بڑھی ہیں دُوریاں رُوبینہؔ اتنی
وہ جِتنا پاس آتا جا رہا ہے

''قیمت''

واہ۔۔۔

کیا بات ہے۔۔۔!

اُس نے تو

منہ مانگی دولت کی

پیش کش کی۔۔۔

اپنی پسند کی خاطر

مان گئے۔۔۔

کہ

پسند کی نہیں ہوتی

کوئی

قیمت

☆

"پہچان"

تُم
ہمیں پاکر بھی
کھو گئے۔۔۔!

اور
وہ ہمیں
کھو کر بھی
پا گئے۔۔۔
کیونکہ
تمہارے پاس
اچھے بُرے کی
نہیں تھی
پہچان
☆

غزل

اتنی توفیق ہو یہ دُعا کیجئے
جیسے ممکن ہو سب کا بھلا کیجئے

جس کے باعث تھی آدم نے پائی سزا
ایسی ویسی نہ ہرگز خطا کیجئے

ایسا کرنا نہیں ہے عبادت سے کم
فرض جو بھی ہو اپنا ادا کیجئے

میں خطاؤں سے ہرگز نہ باز آ سکوں
کوئی تجویز ایسی سزا کیجئے

یاد رکھیئے ہے اِخلاق بھی کوئی شے
جب کسی بات کی اِنتہا کیجئے

ہم نہ شِکوہ کریں گے کسی طور بھی
شوق سے ہم پہ جَور و جفا کیجئے

جھوٹ کہہ کر بھی نادم نہیں جو ہوا
ایسی صورت میں رُوبینہ کیا کیجئے

"East or west home is the best"

مشرق سے مغرب کا
سفر ہی نہیں۔۔۔
بلکہ
جنوب سے شمال
تک کا۔۔۔
سفر کرنے کے بعد ہی
کرائے کے عالیشان
محلوں میں
چندروز
قیام کرنے کے بعد ہی
میں اس نتیجے پہ پہنچی
کہ

"East or west home is the best"

غزل

میں زندگی میں بارہا ناکام ہو گئی
اس کشمکش میں زندگی کی شام ہو گئی

اُس نے اُٹھائیں جب بھی مرے فن پہ اُنگلیاں
شہرت زمانے بھر میں مری عام ہو گئی

یہ میری صاف گوئی کا مجھ کو صِلہ مِلا
اتنی سی بات کے لئے بدنام ہو گئی

اِس زندگی کو جینے میں کچھ اور لُطف تھا
یہ زندگی اگر ہو تیرے نام ہو گئی

جو بات ڈھل گئی میرے شعروں کی شکل میں
میرے لبوں پہ آتے ہی اِلہام ہو گئی

رُوبینہ اب کسی کے دل میں بھی نہیں خلوص
اس دَور میں بات ہے یہ عام ہو گئی

''رات کی رانی''

زمینِ دِل میں
اُگنے والی
یہ چھوٹی سی بیل
نہ جانے کیسے۔۔۔؟
اتنی بڑی ہوگئی۔۔۔!
کہ میرے تن اور من کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا
اب جبکہ میں اِسے
اپنے وجود سے الگ کرنا چاہتی ہوں
مگر وہ دِن بہ دِن پھیلتی ہی جارہی ہے
لے رہی ہے اپنی مضبوط گرِفت میں مجھے
جھکڑ چکی ہے
اپنے پھیلاؤ سے
میرے پورے بدن کو۔۔۔
مہکا رہی ہے
اپنی بھینی بھینی خوشبو سے

میرے تن اور من کو
مہک رہی ہے
میرے دل کے اندر
رات کی رانی کی طرح
''تیری یاد''

☆

''دال میں کالا''

یہ
تمہیں کیا ہو گیا۔؟
کہ
کھاتے ہی جا رہے ہو
باوجود
اس کے
کہ
''دال میں کچھ کالا ہے''

☆

''عارضی رہائش''

چُن چُن کے تنکے

یہ پرندے

کیوں بناتے ہیں۔۔۔؟

آشیاں

باوجود

یہ جاننے کے

کہ اُنکی ہے

''عارضی رہائش''

☆

''رشتہ''

وہی

تو ہے میرا بھی

تُم سے

جو

روح کا ہے

بدن سے

رِشتہ

☆

"ٹوٹ گیا"

افسوس۔۔۔!
کتنی کمزور تھی
بنیاد
اِس رشتے کی
جو
ہوا کے ایک جھونکے سے
ٹوٹ گیا

☆

''سمندر کو کوزے میں بند''

افسوس۔۔۔!

تُم نے مجھے

لالچ کے ترازو سے تولا۔۔۔۔

یعنی

کبھی دولت کے ساتھ

کبھی شہرت کے ساتھ

تمہاری نظروں میں دولت اور شہرت کا وزن بڑھ گیا۔۔۔!

میرے وجود کے مقابلے میں۔۔۔!

تُم نے کھوٹا سِکّہ سمجھ کر مجھے پھینک دیا

میں حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔۔۔!

کہ کیا میرے وجود کا کوئی وزن نہیں

میں نے خود کو ڈھونڈا

گویا

تب تک میں بے خبر تھی

اور تم اپنی مرضی سے ترازو کا پلڑا ہلکا کرتے رہے

لیکن اب جب میں نے خود اپنا وزن ناپنا چاہا

تو تمہاری دولت اور شہرت کے مقابلے میں
میرے وجود کا میری ذات کا وزن بڑھ گیا
کیوں کہ میں اگر چاہوں تو
سمندر کو کوزے میں بند کرسکتی ہوں
مگر تُم
کبھی ایسا نہیں کرسکتے

☆

غزل

خموشی سے آنسو پیئے جا رہے ہیں
مگر اس پہ بھی ہم جیئے جا رہے ہیں

ستم پر ستم وہ کئے جا رہے ہیں
مگر ہم دُعائیں دیئے جا رہے ہیں

لبوں پر ہے بکھری ہوئی مُسکراہٹ
کہ ہم زخم دِل کے سیئے جا رہے ہیں

اُنہیں کون پوچھے اُنہیں کون ٹوکے ؟
جو آتا ہے مَن میں کیے جا رہے ہیں

رُوبینہؔ کوئی غم ہو سہتا ہے ہنس کر
کہ ہم داد دِل کو دئے جا رہے ہیں

''اے زِندگی''

موت کو۔۔۔
اِتنے قریب سے۔۔۔!
دیکھنے کے بعد
ہم۔۔۔
تُم پہ۔۔۔
کیسے کر سکتے ہیں بھروسہ؟
''اے زندگی''

(کشمیر کے سیلاب زدگان کے نام۔ 20-09-2014 کو لکھی ایک نظم)

غزل

اخلاص کی ، وفا کی عادت بدل رہا ہے
انسان مصلحت کے سانچے میں ڈھل رہا ہے

کس درجہ مختلف ہیں اِس زندگی کی قدریں
اوروں کا دَرد جب سے اِس دل میں پل رہا ہے

محسوس ہو رہا ہے کچھ بھی نہیں نظر میں
اک سایہ بن کے کوئی مرے ساتھ چل رہا ہے

سب بے وفا نہیں ہیں سب با وفا نہیں ہیں
یہ سلسلہ ازل سے دُنیا میں چل رہا ہے

رُوبیناؔ کچھ بھی کہئے لیکن ہے یہ حقیقت
اِک دوسرے سے اِنساں کس درجہ جل رہا ہے

رُوبیناؔ اِس سے ہرگز میں منحرف نہیں ہوں
لگتا ہے وقت جیسے کروٹ بدل رہا ہے

''مجھے جینا ہوگا''

تمہیں
کیا لگتا ہے۔۔۔؟
کہ
میں جی نہیں پاؤں گی۔۔۔
تمہارے بغیر۔۔۔!
مانا کہ
میری ہمت جواب دے چکی ہے
میں شیشے کی طرح
ٹوٹ کر۔۔۔!
بکھر چکی ہوں
باوجود اِس کے
مجھے جینا ہوگا
اُن معصوم جانوں کے لئے
جن کے ارمانوں سے کھیلا جاتا ہے
جن کے خوابوں کو قتل کیا جاتا ہے
جن کی حسرتوں کو دفنایا جاتا ہے

جانتی ہوں۔۔۔
کہ یہ لڑائی لڑتے لڑتے
میرا وجود میرا جسم میری روح زخمی۔۔۔
لہولہان ہو سکتے ہیں
مگر پھر بھی
مجھے ہمت کرنی ہے
مجھے لڑنا ہے
اُس ظلم کے خلاف
جو صنفِ نازک کی تقدیر کا حصّہ بن چکا ہے
اُسے ختم کرنے کے لئے
''مجھے جینا ہوگا۔ مجھے جینا ہوگا''

☆

غزل

اُس نے چوراہے پر کیا چھوڑ دیا ہے ؟
انجان راستوں سے مجھے جوڑ دیا ہے

اُس نے افسانے کو کیا موڑ دیا ہے
دانِستہ اُسے دوسروں سے جو دیا ہے

افسوس کہ حق کو کبھی حق کہہ نہ سکا وہ
اتنی سی اِک بات نے دِل توڑ دیا ہے

کچھ اپنوں کے انداز ہیں دُنیا سے نِرالے
کچھ گردشِ ایام نے دِل توڑ دیا ہے

دُنیا کی روِش اور ہے دُنیا کا چلن اور
حالات نے لا کر یہ کہاں چھوڑ دیا ہے ؟

محسوس یہ ہوتا ہے بھنور بھی ہے کہیں پاس
طوفان نے کشتی کو کہاں چھوڑ دیا ہے

رُوبینہ مرے خوابوں میں آتا ہے بار بار
وہ شہر کہ مدّت سے جِسے چھوڑ دیا ہے

''جان''

میں تو پہلے ہی
سمجھ گئی تھی۔۔۔

کیا۔۔۔؟

یہی نا۔۔۔

کہ تم

مجھ سے

جھوٹ بول رہے ہو

وہ کیسے۔۔۔؟

وہ ایسے۔۔۔

کہ

جب تم نے کہا تھا

''تم جان ہو میری جان''

جبکہ

یہ بات

بالکل

برعکس ہے
حقیقت کے
کیا۔۔۔؟
جسم سے
کبھی
الگ رہ سکتی ہے
''جان''
☆

غزل

تڑپ کے رہ گئیں نظریں یہ بے بسی کی طرح
وہ میرے شہر سے گزرے ہیں اجنبی کی طرح

نبھاتے دوستی ہم سے وہ چھوڑئے اس کو
کہ دشمنی بھی نبھائی نہ دشمنی کی طرح

نہ اپنا پن تھا کسی میں نہ وہ خلوص و وفا
ہزاروں لوگ ملے ہم کو آپ ہی کی طرح

مری نگاہ میں جیسے کوئی ہے جلوہ فروز
چمک رہی ہے کوئی چیز روشنی کی طرح

کسی طرح بھی نہ تم ہونا اِس سے رنجیدہ
اگر سلوک کسی کا ہے اجنبی کی طرح

تمام عمر رہے گا یہ اس سے وابستہ
مرے لبوں پر ترا ذکر ہے ہنسی کی طرح

وہ دِن گئے کہ رُوبینہ وقار تھا اِس کا
نہیں ہے زندگی یہ آج زندگی کی طرح

''زندان''

زندان کا نام سنتے ہی۔۔(قاری یا سامع کے)
ذہن میں
تہاڑ جیل، کورٹ بلوال، ڈھانگری جیل۔۔۔
نہ جانے کتنی ہی جیلوں کا نقشہ گھوم گیا ہوگا۔۔۔!
مگر میری مُراد
یہاں اُس زندان (جیل) سے نہیں
جہاں پر مجرموں کو جُرم کی سزا کے لئے
ایک متین وقت کے لئے قید رکھا جاتا ہے
بلکہ
میری مراد
اُس زندان سے ہے۔۔۔
جہاں پر صنفِ نازک کی روح کو قید کیا جاتا ہے
یعنی
زندگی جینے کے عوض میں
اُسے زندہ رہنے کے لئے

سماج کے بنائے گئے قاعدے قانون کے مطابق ہی چلنا ہے
جس کے لئے۔۔۔
اُسے اپنی رُوح کو قید کروانا ہے
اپنی آواز کو قید کروانا ہے
یعنی وہ اپنی مرضی سے
نہ سانس لے سکتی ہے۔۔۔
نہ بول سکتی ہے۔۔۔
نہ رائے دے سکتی ہے۔۔۔
نہ معلوم آپ کی نظر میں کیا ہے۔۔۔؟
مگر میری نظر میں۔۔۔
یہ بھی تو ہے
اِک
''زندان''

☆

غزل

یہ حقیقت ہے کہ خوش رہتی ہوں میں
تُم کیا جانو کتنے غم سہتی ہوں میں

اِس پہ بھی خاموش ہی رہتی ہوں میں
زندگی میں ہر سِتم سہتی ہوں میں

میں کسی کا پھر نہیں کرتی لحاظ
جب کبھی جذبات میں بہتی ہوں میں

اِس پہ بھی آتا نہیں اُس کو یقین
جو بھی کہتی ہوں وہ سچ کہتی ہوں میں

میں ہوں اپنی زندگی سے بے نیاز
کھوئی کھوئی سی کہاں رہتی ہوں میں

زندگی ہے ایک بحرِ بیکراں
اِس میں تِنکے کی طرح بہتی ہوں میں

غزل

یہ یاد رہے ایسا مقدر نہ مِلے گا
ہم جیسا یقیناً کوئی رہبر نہ ملے گا

رہنا پڑے گا تُم کو کرائے کے مکاں میں
گھر چھوڑ کے جاؤ گے تو پھر گھر نہ ملے گا

مشکل ہے کہ رہ پائیں گے یہ دونوں سلامت
پگڑی کو بچاؤ گے اگر سَر نہ ملے گا

ڈھا کر جو سِتم پوچھے گا کیا حال ہے کہیئے
دُنیا میں کوئی اُس سا سِتم گر نہ ملے گا

سو غم بھی اُٹھا کر مجھے ہو گی نہ شکایت
مجھ سا کوئی بھی رنج کا خوگر نہ ملے گا

ڈھونڈیں گے برابر تجھے پھر دیر و حرم میں
جب ڈھونڈنے والوں کو تیرا گھر نہ ملے گا

رُوبینہؔ یہ اُمید نہیں کہ دیکھ سکیں ہم
جب دُنیا میں کوئی بھی بے گھر نہ ملے گا

''دونوں مصروف''

ٹن ٹن، ٹن ٹن
ہیلو، ہیلو
ابھی ۔۔۔
کال نہیں کرنا
کیونکہ ۔۔۔
ابھی میں گھر میں ہوں
ٹن ٹن، ٹن ٹن
ابھی
کال نہیں کرنا
کیونکہ
ابھی وہ گھر میں ہیں
''دونوں مصروف''

(موبائل فون سے سماج میں پھیلی بُرائی کے پس منظر میں)

غزل

وہ اپنے زخم سارے بھر چکا تھا
علاج اپنے غموں کا کر چکا تھا

صدائیں دیر تک دیتا رہا وہ
ہمارے پہنچنے تک مر چکا تھا

اُسے دُنیا نہ ہر گز راس آئی
ہزاروں بار کوشش کر چکا تھا

تھا اُس کے چہرے سے یہ صاف ظاہر
مسیحا سے وہ اپنے ڈر چکا تھا

بظاہر دیکھنے میں تھا وہ زِندہ
حقیقت ہے کہ کب کا مر چکا تھا

ہوا دل کا سکوں اُس کو نہ حاصل
تھے جتنے مرحلے طے کر چکا تھا

جھکے گا یہ نہ رُوبینہؔ کہیں بھی
مرا دِل فیصلہ یہ کر چکا تھا

غزل

تسلیم ہے ہم کو کہ اداکار نہیں ہیں
مگر دُنیا میں ہم اتنے بھی بے کار نہیں ہیں

تُم جن کو سمجھتے ہو محافظ ہیں وطن کے
یہ راہ نما صاحبِ کردار نہیں ہیں

ہم مانتے ہیں اِن کو حکومت ہے میسّر
یہ سایۂ دیوار ہیں دیوار نہیں ہیں

چُپ رہتے ہیں دُنیا کی کچھ باتوں پہ لیکن
تُم یہ نہ سمجھنا کہ ہم اِنکار نہیں ہیں

اخلاص و وفا سے نہیں جس کو کوئی نِسبت
ہم ایسی محبت کے طلب گار نہیں ہیں

اپنے لئے بن سکتے ہیں ہم وجہِ مصیبت
اوروں کے لئے باعثِ آزار نہیں ہیں

جو زندگی کی مشکلیں ہیں ان سے برابر
رُوبینہ ہم کب بَرسرِ پیکار نہیں ہیں
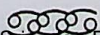
مبارک باد

مُبارک ، مُبارک تمہیں شادمانی
مبارک ہو تُم کو حسیں زندگانی

پکڑے رکھا تو نے اُس کا ہی دامن
کہ جس میں تھی مُضمِر تیری کامرانی

تھی خواہش یہ خورشید و مریم کے دِل کی
ملے بیٹے طایئر کو صُبح سُہانی

پھلے پھولے دُنیا میں یہ زندگانی
میسّر ہو تم کو ہر اک شادمانی

امیرِ شہر سے نہ مرعوب ہونا
غریبوں کی سُننا تو دِل سے کہانی

دُعا ہے کہ راس آئے یہ زندگانی
ملے زندگی میں ہر اِک شادمانی

دِیا رب نے انصاف کا تم کو منصب
چلانا اِس منصب پہ حکمِ ربانی

یہ احساں ہے تم پہ تیری پیاری ماں کا
دُعاؤں کے صدقے ہوئی مہربانی

مبارک ہو ہر حال میں زندگانی
ملے زندگی بھر تمہیں شادمانی

ہے راجوری کو کس قدر ناز تُم پر
بیاں کر سکوں کیا قلم کی زبانی

چمن کو ملی آج جس گُل سے رونق
مِلے تا قیامت اِسے زندگانی

زمانے کے کام آئے یہ زندگانی
مُبارک ، مُبارک تمہیں شادمانی

"طاہر خورشید رینہ، تھنہ منڈی کے نام"

غزل

کیا قیامت آج ہے آئی ہوئی
آسماں پہ ہے گھٹا چھائی ہوئی

کیا کسی نے طنز سے کچھ کہہ دیا
اُس کی صورت کیوں ہے مرجھائی ہوئی

وہ سمجھتا ہے کسی کے دَرد کو
جس نے خود بھی چوٹ ہو کھائی ہوئی

فرصت کہاں کہ پوچھ لے اُس سے کوئی
آنکھ تیری کیوں ہے بھر آئی ہوئی

چند سانسوں کا یہ سارا کھیل ہے
زندگی کس پر ہے اِترائی ہوئی

کیا رُوبینہ ہے یہی جمہوریت
ہر طرف ہے بے بسی چھائی ہوئی

''مقام ومرتبہ''

تیری اَن گنت
خواہشوں میں
تیری اَن گنت
چاہتوں میں
میری عزّت
میرااحترام
میرامقام
کہاں پہ ہے۔۔۔؟
نمبرایک۔۔۔
نمبردو۔۔۔
یاپھر
نمبرتین۔۔۔
میرے اَن گنت
چاہنے والوں میں
تیری عزت
تیرااحترام
تیرامقام
سب سے
اعلیٰ ہے

☆

غزل

بے بسی اس میں ابھی ٹھہری نہیں
اس لئے یہ زندگی بِکھری نہیں

کھینچی جو تصویر بھی دُھندلا گئی
آئینۂ دِل میں وہ اُتری نہیں

حادثے ہوتے رہے ہیں ہر قدم
دل کی بستی اس پہ بھی اُجڑی نہیں

ساری دُنیا پر ہے وہ چھایا ہوا
شکل جس کی آج تک دیکھی نہیں

ذِکر تک اُس کا لبوں سے دُور ہے
اس لئے یہ زندگی نِکھری نہیں

جھوٹ سے لیتی نہیں ہُوں کام میں
اس لئے قسمت مری سنوری نہیں

سخت حیرت ہے مجھے رُوبینہ تو
ٹھوکریں کھائیں مگر سُدھری نہیں

"وجہ"

تُم کیا جانو۔۔۔؟
ہمارے چُپ رہنے کی
آخر
کیا ہو سکتی ہے۔۔۔
وجہ
☆

غزل

ہم سچ کو سچ کہتے رہیں گے
جو بھی ستم ہو سہتے رہیں گے

جب تک کشتی پار نہ ہوگی
ہم طوفاں میں بہتے رہیں گے

تیز حوادث کی زد میں ہم
رہتے رہے ہیں رہتے رہیں گے

کبھی نہ توڑیں گے ہم وعدہ
اس پر قائم رہتے رہیں گے

سنیں گے اس کو خاموشی سے
وہ جو کچھ بھی کہتے رہیں گے

موجِ تلاطم کے ہمراہ ہم
تنکے بن کر بہتے رہیں گے

رُوبینہؔ انجام ہو کچھ بھی
جو کہنا ہے کہتے رہیں گے

غزل

رفتہ رفتہ وہ مری باتوں کے قائل ہو گئے
ہوتے ہوتے اس طرح حل سب مسائل ہو گئے

زندگی میں ہر مصیبت سے مِلی اُن کو نجات
زندگی میں جو بھی تیرے دَر کے سائل ہو گئے

کیا بتاؤں دیر تک پھر سِلسِلہ جاری رہا
جب کبھی بھی بات کرنے پر وہ مائل ہو گئے

یہ سیاست دان پی جائیں گے لوگوں کا لہو
زندگی میں جب انہیں حاصل وسائل ہو گئے

مسئلہ یہ ہے کہ اب کِس کِس کو دیں نذر و نیاز
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے سائل ہو گئے

زندگی میں اہل دُنیا سے نپٹ پائیں گے ہم
سو طریقے سوچے تھے لیکن وہ زائل ہو گئے

کٹ رہی تھی زندگی رُوبینہ کتنی پُر سکوں
لوگ میرے اور ان کے بیچ حائل ہو گئے

غزل

کوئی شے ہرگز نہ تیرا آسرا بن پائے گی
زندگی کا راز تجھ کو زندگی سمجھائے گی

ہم نے مانا اِس کو ہے گھیرے ہوئے غم کا ہجوم
تیرے دِل کی بزم میں اک دن خوشی بھی آئے گی

تجھ کو جس کا آسرا ہے تجھ کو جس پر فخر ہے
یہ گھرونده ریت کا آندھی اُڑا لے جائے گی

چشمِ حیرت سے تو اِس کو دیکھتا رہ جائے گا
پھول کی ساری مہک بادِ صبا لے جائے گی

کتنی یادیں تازہ ہو جائیں گی میرے ذہن میں
جب کبھی اُس کی نظر سے یہ نظر ٹکرائے گی

یہ حقیقت ہے کہ رُوبینہ چھڑے گا ذکر جب
یاد اس کی دیر تک دل کو میرے بہلائے گی

غزل

وہ کب باتوں سے دل ڈستے نہیں ہیں
کہ طعنے ہم پہ کب کستے نہیں ہیں

محبّت ہی نہیں ہے جن کے دِل میں
کہ لوگ ایسے کہاں بستے نہیں ہیں

کٹی ہو عمر جن کی جھونپڑوں میں
کسی کے حال پر ہنستے نہیں ہیں

نہیں آنکھوں سے ہوتے اشک جاری
یہ موتی اِس قدر سستے نہیں ہیں

بنائے رکھتے ہیں ہر وقت دُوری
وہ اِس دِل میں کبھی بستے نہیں ہیں

ہے منزل سامنے رُوبینہؔ لیکن
گزرنے کے لئے رستے نہیں ہیں

”شیر گھاس نہیں کھاتے“

یہ
تم نے کیسے سوچ لیا۔۔؟
کہ
ہم
کچھ بھی
مطلب کہ کچھ بھی کھالیں گے۔۔۔!
نہیں ہرگز نہیں
شیر بوڑھے ہو جائیں
مگر
گھاس نہیں کھاتے۔۔۔!

☆

غزل

یہ دیکھ کر میں خود بھی حیران ہو گئی ہوں
میں اپنی زندگی کی پہچان ہو گئی ہوں

کچھ لوگ میرے فن پر اُٹھاتے ہیں اُنگلیاں
میں جان بوجھ کر بھی انجان ہو گئی ہوں

جب بھی ہو کوئی سازش ہوتے ہیں اس میں شامل
اپنوں کی اِس ادا پر حیران ہو گئی ہوں۔۔۔!

اُس کے سِتم کا کوئی بھی اب گِلہ نہیں ہے
مشکل میں تھی ضرور میں آسان ہو گئی ہوں

زمانے سے پوچھتی ہوں رُوبینہؔ کون ہوں میں؟
خود اپنی ذات سے بھی انجان ہو گئی ہوں

رُوبینہؔ سادہ دل ہوں میں سادہ دِل رہوں گی
اپنی اداؤں پر میں قربان ہو گئی ہوں

”سوچتی ہوں“

کہ
آپ سے بات نہ کروں
کیوں کہ
انفکشن ہو جاتا ہے
دوا بھی نہیں ملتی
کہیں سے
اس انفکشن کی
اس بارے میں
آپ کا
کیا خیال ہے۔۔۔؟
جو میں
سوچتی ہوں۔۔۔

☆

غزل

ہم آئے ہیں اگر دُنیا میں اک دِن لوٹ جانا ہے
کرائے کا مکاں ہے یہ اسے کب تک سجانا ہے

نہیں یہ جانتے ہرگز کہ کیسے مسکرانا ہے
غریبوں کے مقدر میں فقط آنسو بہانا ہے

اندھیرے حسرتوں کے ورنہ مجھ کو کاٹ کھائیں گے
دیا اُمید کا اس دل کی بستی میں جلانا ہے

غم و االام سے ہر گام پر ٹکرانا ہے ہم کو
کہ عادت ہے ہماری مسکرانا ، مسکرانا ہے

بھروسہ کر رہے ہیں کس قدر اس زندگی پر ہم
یہ مٹی کا گھروندہ ہے کسی دِن ٹوٹ جانا ہے

نہ دستورِ وفاداری نہ وہ اِخلاص کی باتیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ کیسا زمانہ ہے

کسی صورت بھی ہونٹوں پر ہنسی آئے ہے ناممکن
اگر تقدیر میں اُس کے فقط آنسو بہانا ہے

''دھوکہ''

آخر

تم نے

وہی کیا۔۔۔

جس کی۔۔۔

مجھے فکر تھی۔۔

جس کا

مجھے ڈر تھا

یعنی

جھوٹ۔۔۔

فریب۔۔۔

دھوکہ۔۔۔

☆

غزل

جو تنہائیاں ہوں تو گھر کاٹتا ہے
کہ دیواروں کے ساتھ دَر کاٹتا ہے

نہ ہو ہم سفر کوئی جب ساتھ اُس کے
مسافر کو ایسا سفر کاٹتا ہے

نہیں مل سکے گا کہیں پر بھی سایہ
بشر کیوں یہ سارے شجر کاٹتا ہے

کوئی کر سکے گا نہ اِنکار اِس سے
جو بوتا ہے ویسا ثمر کاٹتا ہے

کئی بار ہوتا ہے احساس اس کا
نہ ہو جب وہ گھر میں تو گھر کاٹتا ہے

ہے پالا پڑا کس زمانے سے مجھ کو ؟
میری ہر دُعا کا اثر کاٹتا ہے

رُوبینہ ہے شعروں میں یہ دَرد کیسا۔۔؟
مجھے خود بھی اِن کا اثر کاٹتا ہے

''خواب''

ٹوٹ جاتے ہیں

جب

تو

کہاں جُڑ پاتے ہیں
کانچ کے کھلونوں کی طرح
کتنے نازک

ہوتے ہیں

یہ
خواب

☆

غزل

ٹل جائیں اُس کے سر سے بلائیں خدا کرے
لگ جائیں اُس کو میری دُعائیں خدا کرے

اِنساں جو بانٹتے ہیں کدورت کے زہر کو
مہر و وفا کے جام اُنڈھائیں خدا کرے

اپنی تو ساری عمر اِسی میں گزر گئی
کچھ فرض اپنا وہ بھی نبھائیں خدا کرے

اِنساں جو ایک دوجے سے رہتے ہیں دُور دُور
اے کاش! سب کو اپنا بنائیں خدا کرے

وہ جن کو ایک لمحہ بھی فرصت نہیں نصیب
میرے غریب خانہ پہ آئیں خدا کرے

رُوبینہؔ اُن پہ ہو نہ کبھی اس کا کچھ اثر
ہم دل کا درد دِل میں چھپائیں خدا کرے

''زعفرانی قہوہ''

برفیلے موسم میں
مُضر نہیں ہے
اگر صحیح استعمال کیا جائے۔۔۔
بہت ساری بیماریوں پر
استعمال ہوتا ہے
دوائی کے طور۔۔۔
مُضر ہے۔۔۔
ایسی صورت میں
کہ جب اس کا غلط
استعمال کیا جائے
یعنی
زعفران کے کاشت کار
یہ سوچ کر
اُس کا استعمال کریں
کہ یہ۔۔۔
ہمارے ہاتھوں کی پیداوار ہے

ہم اِسے۔۔۔

جب چاہیں۔۔۔

جیسے چاہیں۔۔۔

استعمال کر سکتے ہیں۔۔۔

ویسے تو

پوری دُنیا میں

مشہور ہے

کشمیر کا

''زعفرانی قہوہ''

☆

غزل

بھول جو پائے مُشکل سے
یاد وہ آئے مُشکل سے

ٹوٹنے والے تھے رشتے
ہم نے بچائے مُشکل سے

ہم میں گو توفیق نہ تھی
زخم ہیں کھائے مُشکل سے

یہ دِل کتنا نازک تھا
غم ہیں اٹھائے مُشکل سے

تلخ تھے ماضی کے لمحے
ہم نے بھُلائے مُشکل سے

ہم سے دُور جو رہتے تھے
پاس وہ آئے مُشکل سے

رُوبینہ تھا ضبط بہت
اشک بہائے مُشکل سے

''حیرت''

سُنا ہے
کہ
اس دَور میں بھی
کوئی شاہجہان ہے
جو
(اپنی ممتاز کے لئے)
تاج محل تعمیر کرنے جا رہا ہے
اس بات پر
''حیرت''
تو ہے!

☆

''بھروسہ''

میں بھی
وہی کروں گا
جو
شاہجہاں نے
کیا تھا
ممتاز کے لئے
مگر
تم
بھروسہ تو کرو

☆

''مجبوری''

جانتی ہوں
کہ
ہم سے بات کرنا
اب تمہارا شوق نہیں
اور
نہ ہی تمہاری ضرورت ہے
بلکہ
مجبوری۔۔۔
صرف
مجبوری

☆

غزل

اُلٹے سیدھے جو خواب آتے ہیں
لے کے گھر میں عذاب آتے ہیں

میرا گھر جھونپڑی ہی سہی۔۔۔
ٹھہرنے کو نواب آتے ہیں

کتنی خوشیاں ملی ہیں کتنے غم
ہم کو سارے حِساب آتے ہیں

آدمی ڈگمگا سا جاتا ہے
اُس کے دِن جب خراب آتے ہیں

یہ الگ بات بھول جائیں ہم
یاد ماضی کے باب آتے ہیں

خاک منزل ملے گی رُوبینہ
راستے جب خراب آتے ہیں

"عِیادَت"

واہ۔۔۔
کیا ہی نمک پاشی کی
میرے زخموں کی
یہ پوچھ کر
کہ
اب طبیعت کیسی ہے۔۔۔؟
☆

''ملیریا نہیں لوّ یریا''

ڈاکٹر
آج پھر وہی
بے چینی بے قراری
ذہنی تناؤ۔۔۔
سر میں چکر
خون کی جانچ بھی کروائی ہے
مگر
رپورٹ ایک دَم صاف
آپ کو ملیریا تو نہیں۔۔۔؟
جو خون کی جانچ کروائی ہے
تو پھر کیا ہے (ڈاکٹر)
آپ کو تو لویریا ہے
اُف۔۔۔!
ڈاکٹر وہ کیا بیماری ہے۔۔۔؟
دیکھو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں
سائنس دانوں کی تحقیق سے معلوم ہُوا
کہ دنیا میں ہر تیسرے بندے کو یہ بیماری ہے
کیوں کہ
اس (بیماری) کے بیکٹر یا ہر جگہ پائے جاتے ہیں

ڈاکٹر
کیا یہ کسی زہریلے مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے
نہیں بیوقوف۔۔۔!
یہ بیکٹر یا صرف
انسان کے اندر ہوتے ہیں
وہ بھی
کسی کی آنکھ میں
کسی کی ذات میں
کسی کی بات میں
کسی کے ساتھ میں
ڈاکٹر
اس کا علاج۔۔۔!
بہت مشکل۔۔۔؟
ہاں
ایک صورت میں
ہوسکتا ہے
وہ کیسے۔۔۔؟
اگر
وہ شخص مل جائے۔۔۔

☆

''فرق''

وقت
عام آدمی کا بھی
ہوتا ہے
اتنا ہی قیمتی
جتنا کہ
خاص آدمی کا۔۔۔
فرق
صِرف
اتنا ہے
کہ
عام آدمی کا وقت
مفت میں ہوتا ہے
صَرف
اور خاص آدمی
ایک ایک لمحے کی
وَصول کرتے ہیں
قیمت

☆

غزل

گِر کر کیسے سنبھلا ہوگا
نشے نے جب اُسے جکڑا ہوگا

اُس کا گھر آنا تھا مشکل
ہاتھ کسی نے پکڑا ہو گا

لوگ برابر ہنستے ہوں گے
کتنا عجیب تماشا ہو گا

مَد ہوشی کے عالم میں وہ
ٹھوکر کھا کر اکڑا ہو گا

وہ پہچان نہ پایا مجھ کو
اُس نے جب بھی دیکھا ہو گا

میں نے سمجھ لیا یہ وہ ہے
شاید مجھ کو دھوکا ہو گا

گھر آنے تک اے رُوبینہ
وہ گلیوں میں بھٹکا ہو گا

(منشیات سے سماج میں پھیلی بُرائی کے تناظر میں)

غزل

کیا کریں تدبیر ہم اس کو بچانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہیں گھر کو جلانے کے لئے

صِرف اِک ٹافی سے بچے کا بہل جاتا ہے دِل
وہ تُلے ہیں کس لئے اس کو رُلانے کے لئے

ایسے میں کوئی بتائے جائیں تو جائیں کہاں۔۔؟
اپنا ہی گھر آتا ہو جب کاٹ کھانے کے لئے

برق نے بس ایک پل میں ہے جلایا آشیاں
زندگی درکار ہے جس کو بنانے کے لئے

ہم کو کیا معلوم تھا ہم جل مریں گے اس کے ساتھ؟
ہم تو آئے تھے فقط شمع جلانے کے لئے

آپ کا یہ اپنا گھر ہے جب کبھی فرصت ملے
ہاں کبھی آ جایئے صورت دکھانے کے لئے

ایسا لگتا ہے رُوبینہ بس یہی اک کام ہے
ہم تو آئے ہیں یہاں آنسو بہانے کے لئے

''میری زندگی''

زندگی
تو ہر قدم پر
روکتی رہی راستہ
میرے جینے کا
اور میں ہنس کر، مسکرا کر
ٹال دیتی رہی
اور چھین کر لیتی رہی تجھ سے سانسیں
جینے کے لئے
باوجود یہ سب جاننے کے
کہ تو ان لمحوں سے
مذاق کر رہی ہے
جو مجھے کبھی واپس نہ ملیں گے
زندگی۔۔۔
تیرا میرا جنم جنم کا ساتھ
مگر
کیسا ساتھ نبھاتی ہے تو۔۔۔؟

کبھی کبھی مجھے
چوراہے پر چھوڑ کر تنہا
بے بس اور مجبور کر دیتی ہے
مجھے نئے راستے کا اِنتخاب کرنے کے لئے
کیا تو ہی ہے۔۔۔؟
میری زندگی
☆

غزل

کیا ہے وہ مُجھ کو یہ اندازہ ہوا
اُس کا جب کوئی سِتم تازہ ہوا

میری نظریں دستکیں دیتی رہیں
جب بھی اُس کا بند دروازہ ہوا

سب کی اب پہچان مشکل بن گئی
آج ہر چہرے پہ ہے غازہ ہوا

اُس کی آنکھیں بھی چھلک کر رہ گئیں
میرے غم کا جب ہے اندازہ ہوا

تھا یقیں اُس کا یہ بے بُنیاد ہے
وعدہ اُس کا جب کوئی تازہ ہوا

وہ کہ کرنا چاہتا ہے کچھ سوال
اُس کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا

''ایمانداری''

میں
کمزور سہی
مظلوم سہی
مگر
ہر جنگ میں جیت میری ہوئی ہے
بے شک
ظالم اور سرکش لوگ میرے کھُلے دُشمن ہیں
اور
مجھے قتل کروانے کی سازش میں جُٹے رہتے ہیں
کبھی مجھے اپنے گھر میں پناہ نہیں دیتے
میں بھی
ایسے لوگوں سے ہاتھ نہیں ملاتی
جن کی آنکھوں پر لالچ اور حرص کی پٹی بندھی ہوتی ہے
جن کی آنکھوں میں بینائی نہیں
مجھے پاؤں تلے مَسل کر چلے جاتے ہیں
سچ تو یہ ہے کہ
وہ مجھے جانتے تک نہیں
میرا تعارف
''ایمانداری''

''رشتہ بھروسے کا''

کتنی بے دردی سے
کیا تُم نے
قتل
میری معصوم تمناؤں کا
کتنی بے دردی سے
توڑ دیئے تُم نے
وہ خواب
جو کانچ کی طرح نازک تھے
کتنی بے دردی سے
گھونٹ دیا تُم نے گلہ
میرے ارمانوں کا
مانا کہ
تُم سے
میرا کوئی رِشتہ نہ تھا
مگر یہ۔۔۔
کیا۔۔۔؟
کم تھا۔۔۔!
رِشتہ بھروسے کا

''کشمکش''

تُم پاگل ہو
پاگل ۔۔۔
نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔
کہ میں پاگل ۔۔۔!
نہیں
مگر
ہوبھی سکتا ہے
کیوں کہ۔۔۔؟
اُس نے جب کہا۔۔۔؟
مگر۔۔۔!
ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔؟
اتنے لوگ میری رائے سے اتفاق رکھتے ہیں
آج تک کبھی کسی کو
میری رائے پر اِعتراض نہیں ہوا
توپھر۔۔۔
وہ مجھے پاگل کیسے کہہ سکتا ہے۔۔۔؟
شاید

ہو بھی سکتا ہے۔۔۔!

اُس نے جب کہا

ڈاکٹر سے مشورہ کروں۔۔۔

ڈاکٹر کیا سچ مچ میں۔۔۔

میں پاگل ہوں۔۔۔؟

کیوں۔۔۔؟

تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔؟

ڈاکٹر مجھے کچھ نہیں لگتا

میں بالکل نارمل ہوں۔۔۔

مگر

اُس نے کہا۔۔۔!

اُس نے کہا۔۔۔!

اور تم نے مان لیا

ہاں ڈاکٹر

میں نے مان لیا

کیوں کہ؟

اُس کی

ہر بات

مجھے ماننی ہے

☆

"ایماندار"

(بےایمان)
منتری کو
ڈرنا چاہئے۔۔۔؟
اپنے سنتری سے۔۔۔
کیوں کہ
سنتری
ایماندار بھی
ہوسکتا ہے۔۔۔؟

☆

"ڈر"

کہیں
ایسا نہ ہو
کہ
اشکوں سے چُکانی پڑے
تمہاری قیمت
اے۔۔۔
خوشی کی گھڑیو۔۔۔!

☆

”مان نہ پاؤں گی“

سوچا بھی نہ تھا۔۔۔

کہ

میرے گھر میں مکیں

شخص کو

میں

جان نہ پاؤں گی

پہچان نہ پاؤں گی

شاید

آج بھی

یہ بات

میں

مان نہ پاؤں گی

☆

"شک"

مین گیٹ کے
ہوتے ہوئے

جب
کوئی شخص

چور دروازے سے
اندر آنے کی کوشش کرے

نیت پر
شک۔۔۔؟
تو ہوگا

☆

''لڑکی''

مانا کہ
تم
جو کہہ رہی ہو
وہ ہی صحیح ہے
مگر۔۔۔
تم
کچھ کر تو نہیں سکتی۔۔۔!
کیوں کہ۔۔۔؟
تم
ایک لڑکی ہو
''لڑکی''

☆

''مہا بیوقوف''

یہ جانتے ہوئے بھی
کہ
وہ شخص
تُم سے ہر بار جھوٹ کئے جا رہا ہے
مگر تُم ہو کہ
اُس پر اندھا وِشواس
کیے جا رہے ہو۔۔۔
میری نظر میں
تُم بیوقوف ہی نہیں ہو
بلکہ
ہو
''مہا بیوقوف''

☆

''چند گھڑیوں''

چھین ہی لیا

تُم نے

آخر

مُجھ سے

میرا سکون۔۔۔!

اے

خوشی کی

''چند گھڑیوں''

☆

''غلطی''

معاف کرو۔۔۔!

کس بات کے لئے۔۔۔؟

جب کہ

تُم نے کچھ کیا ہی نہیں

میں نے غلطی کی ہے۔۔۔!

کون سی غلطی۔۔۔؟

کیسی غلطی۔۔۔؟

یہ جو بازی لگائی۔۔۔

ہار اور جیت کی

بس

یہ ہی غلطی ہے میری۔۔۔!

اس کھیل میں تو میں اناڑی ہوں

لیکن

جیتنے کا جنون سر پر سوار۔۔۔

بازی لگا بیٹھی۔۔۔!

ابھی کھیل شروع ہی ہوا تھا
کہ
میں نے ہار مان لی
کیوں کہ؟
میں کھلاڑی نہیں
بلکہ
اناڑی ہوں
جبھی تو میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہوں
اس لئے مجھے معاف کرو۔۔۔!
معاف کرو

☆

''بے بسی''

(ایمانداری پہ پچھتاوا)

کاش! میں نے اپنے ضمیر کا سودا کیا ہوتا۔۔۔!

کاش! میں نے اپنے اندر کے انسان کو مار دیا ہوتا۔۔۔!

کاش! میں نے کسی کے حقوق چھین لئے ہوتے۔۔!

کاش! میں نے بھی کسی معصوم کے ارمانوں کا بے رحمی سے قتل کیا ہوتا

کاش! میں نے کسی کے ارمانوں کے لہو سے اپنا چراغ جلایا ہوتا۔۔!

کاش! میں نے کسی بے زبان پرندے کے یکجا کئے تنکے گھونسلہ بنانے سے پہلے ہی بکھیر

دئے ہوتے۔۔۔!

کاش! میں نے معصوم کلیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنایا ہوتا۔۔۔!

(یعنی آسیہ، نیلوفر)

کاش! میں باطل کے آگے جھک گیا ہوتا

کاش! میں نے جائز و ناجائز میں تمیز نہ کی ہوتی۔۔!

کاش! میں نے صحیح و غلط، حرام و حلال میں فرق نہ کیا ہوتا۔۔۔!

کاش! میں نے مال و دولت، گاڑی، بنگلے سے شادی کرلی ہوتی

(یعنی اُس امیرِ شہر کی بیٹی سے) جس نے غریبوں اور مسکینوں کا خون چوس کر، شان و شوکت

مل کی ہے

ومت جس کی مُٹھی میں ہے

اش! میں نے بھی وہی کیا ہوتا جو وہ لوگ کر رہے ہیں

ج یہ دِن نہ دیکھنا پڑتا

(حکومت کا ایماندار آفیسر کے ساتھ دوہرا معیار)

''یومِ مادر''

ماں۔۔۔
میں تجھے
سال میں ایک بار
صِرف ایک بار۔۔۔؟
یاد کروں۔۔۔؟
تعجب ہے۔۔۔!
کہ
تو نے مجھے
اُنگلی پکڑ کر چلنا سِکھایا
تو نے مجھے
اپنی زبان سے بولنا سکھایا
تو نے مجھے
اپنی آنکھ سے دیکھنا سکھایا
میں سانس لیتی رہی
نو مہینے (یعنی شکم مادر میں)
تیری ناک سے
تو میری تاریک راہوں میں

حاصل کی ہے
حکومت جس کی مُٹھی میں ہے
کاش! میں نے بھی وہی کیا ہوتا جو وہ لوگ کر رہے ہیں
آج یہ دِن نہ دیکھنا پڑتا

(حکومت کا ایماندار آفیسر کے ساتھ دوہرا معیار)

"یومِ مادر"

ماں۔۔۔
میں تجھے
سال میں ایک بار
صِرف ایک بار۔۔۔؟
یاد کروں۔۔۔؟
تعجب ہے۔۔۔!
کہ
تو نے مجھے
اُنگلی پکڑ کر چلنا سِکھایا
تو نے مجھے
اپنی زبان سے بولنا سکھایا
تو نے مجھے
اپنی آنکھ سے دیکھنا سکھایا
میں سانس لیتی رہی
نو مہینے (یعنی شکم مادر میں)
تیری ناک سے
تو میری تاریک راہوں میں

روشنی کی کِرن بن کر
مجھے راستہ دکھاتی رہی
تیری دُعائیں
میری مصیبت کی گھڑیاں ٹالتی رہیں
تو اپنی زندگی کا
ہر لمحہ
میری خوشیوں پہ قربان کرتی رہی
اے عظیم ہستی۔۔۔!
''ماں''

☆

''تعجب ہے''

میری شاعری
پڑھنے (یا سننے)۔۔۔
کے بعد
مجھ سے
طرح طرح کے سوالات
کرنے سے پہلے
سوچتا کیوں نہیں؟
یہ سماج۔۔۔
کہ
میں
جو کچھ بھی لکھ رہی ہوں
وہ سب
اسی کی دَین ہے۔

☆

”کل بھی تھی بے گھر، آج بھی ہے بے گھر“

افسوس۔۔۔!

پندرہ سال بعد بھی تیرا کوئی حق نہیں

اِس گھر میں۔۔۔

بے دخل کردیا گیا تجھے

تیری معمولی سی غلطی پر

کیا تیرا کوئی گھر نہیں۔۔۔؟

نہ شادی سے پہلے۔۔۔

نہ شادی کے بعد۔۔۔

باپ کے گھر میں بھی امانت ٹھہری

سُسرال میں تیری حیثیت

ایک مشین کی ہے

یعنی گھر چلانے کی مشین

بچے پیدا کرنے کی مشین

اتنا ہی نہیں بلکہ

تو وہ جاندار مشین ہے جسے اپنا ڈرائیور خود بننا ہے

تجھے ہر پل اس خوف میں رہنا ہے کہ

اگر میرا کوئی پُرزہ ناکارہ ہو گیا تو مجھے پھینک دیا جائے گا

تجھے ہر وہ کام کرنا ہے جس پہ تجھے معمور کیا جائے گا
یعنی تو اپنی مرضی کے مطابق نہیں جی سکتی۔۔۔!
باوجود اس کے کہ تیرا حق پتے پہ پانی کی مانند ہے
کہ تنکے چُن چُن کر تو گھر بنائے
اپنی ہر خوشی اِس پہ لٹا دے
ہر وہ چیز جو خون پسینہ ایک کر کے تو بناتی ہے
کِتنی ہی مصیبتیں جھیلتی ہے
دَرد پہ دَرد سہتی ہے
جنم دیتے ہوئے اُس معصوم، ننھی جان کو
جو تیرے وجودِ زمیں سے پھوٹتی ہے
کتنے مراحل سے تو گزرتی ہے نو مہینے
رت جگوں کا یہی ہے صِلہ تیرا
یہ سب کرنے کے باوجود بھی یہ گھر اُسی کا رہا
کہ تیری معمولی سی غلطی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا
کتنی بے رحمی سے نکال دیا جاتا ہے تجھے
یہ کہہ کر طلاق، طلاق، طلاق۔۔۔!
تیرے جسم کے اعضاء یعنی تیرے بچے
تجھ سے چھین لیے جاتے ہیں
تیرے ہاتھوں سے بنی کسی چیز پہ تیرا حق نہیں رہتا
تجھ سے وہ حق بھی چھین لئے جاتے ہیں

جو مالکِ بحر و بر نے تجھے عطا کئے ہیں

کب تک تو اس ظلم کی شکار رہے گی۔۔۔!

کس سے کرے گی۔۔۔؟ اپنی مظلومیت کی شکایت

اِس گونگے بہرے۔۔۔سماج میں

کوئی تیری فریاد سُننے کو تیار نہیں

افسوس

تو کل بھی بے گھر تھی۔۔۔!

آج بھی بے گھر۔۔۔!!

(29-01-2014۔ایک عورت کے طلاق ہونے کے موقع پر لکھی گئی نظم)

روبینہ کے اپنے اعتراف کے مطابق اُس کی سخن گوئی کی معیاد کوئی تین چار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب "تفسیرِ حیات" اُس کی محض دوسری شاخِ نبات ہے۔ مگر یہ برسات ابھی چھم چھم برس رہی ہے۔ اس کتاب میں حسبِ معمول غزلیں زیادہ ہیں۔ نظمیں بھی بہت سی ہیں۔ لیکن مجھے اس کی مختصر نظموں نے بہت زیاد لطف اندوز کیا، ان میں ردیف، قافیے کی کشیدہ کاری سے زیادہ لَے بولتے ہوئے آہنگ اور اُس کے من سر کی کسی بپھری ہوئی موج نے رنگ بھر دیا ہے۔ اِس بہت سی مختصر نظم "بددعا" کو لیجئے یہ اتنی ہی عوام آسا اور عام پسند ہے جتنا کسی پہاڑی جھرنے کے پانی کا ایک گھونٹ، قدرت کی سب سے زیادہ خوبصورت، خوش پسند اور انسان پرور چیزیں مفت اور سستی ہیں۔ پانی، ہوا، پھول، پرندے۔ اُن کی آواز اور چہچہاہٹ، ماں کی ممتا، سچے عاشق کی وارفتگی۔ اس آفاقی سچائی کی کتنی اچھی تصویر روبینہ نے چند ہی لفظوں میں کھینچی ہے۔ آج کی دنیا کا ہر حساس قاری اس پر [illegible] بول اٹھے گا۔ بالکل سچ — اس مجموعے کے دیگر تقریظ کاروں نے رُوبینہ کے کلام کے مختلف زاویوں کا اچھا جائزہ لیا ہے اور اس بارے میں تاثرات کی مختلف دھاریاں [illegible] ہیں۔ اس لئے میرے لئے بات کرنے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس احساس سے معمور ہونے کے باوجود میں اِس مجموعے کی نظم "مذمت" پر کچھ کہنے سے گریز نہیں کر سکتا [illegible] میں شاعرہ کے اندر کی عورت عجیب شوخی کے جتون دکھاتی ہے — مجھے اگر کوئی اُردو نظم کا ایک انتخاب کرنے کی ذمہ داری کے قابل سمجھے تو میں اِس نظم کو شاعرہ کی نو آموزی اور کم [illegible] باوجود اُس میں شامل کروں گا۔ روبینہ میر نے اپنے مجموعے میں تانیثی Sensibility کے چند نمونے پیش کئے ہیں جہاں جہاں اپنے جسم پوش ہم نوا سے اپنی شعری دنیا [illegible] ہے وہاں شاعری کی ساحرہ نے اُس پر اپنے سارے لطف اور رنگ ارزاں اور آسان کر دئے ہیں اور ہمیں اُس سے رنگوں کی اِس سے بڑی دھنک کی اُمید ہے —

محمد یوسف ٹینگ، حکیم باغ، راولپورہ، [illegible] ۲۰۱۴ء

رُوبینہ میر کا دوسرا شعری مجموعہ نہ صرف قافیہ بند غزلوں پر مشتمل ہے بلکہ اُن کا متنوع موضوعات پہ آزاد نظمیں قاری کو نئے فکر و احساس اور ایک [illegible] آسا سماجی صورت حال سے بھی آگاہی فراہم کرتی ہیں۔ رُوبینہ میر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے دوران میں نے بہت سے اشعار ایسے پائے جن میں معنی آفرینی [illegible] صداقت، خیال کی پاکیزگی اور جذبے کی ترسیل کا راست بیانیہ تو ہے ہی اس کے علاوہ آدمی اور انسان میں افتراق اور عورت کی عظمت کا اعتراف مگر مرد غالب معاشرے میں اس کی تذلیل اور سماجی نابرابری کا دُکھ، یہ تمام باتیں رُوبینہ کی شاعری میں در آئی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات و مشاہدات سے سطحی طور پر نہیں گزر جاتی ہیں بلکہ ایک حساس شاعرہ کی حیثیت سے اپنا شعری ردِ عمل بھی بیان کرتی ہیں۔ رُوبینہ میر کے کلام کے حوالے سے یہ بات انتہائی خوش کن، اطمینان بخش اور ان کے روشن مستقبل کا علامیہ کہی جا سکتی ہیں کہ وہ مشرقی اقدار و روایات، آدمی کو انسان بن کے جینے اور بالخصوص مشرقی خاتون کو مغربی تہذیب کی مسموم ہواؤں سے دُور رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ رُوبینہ میر کے ان اشعار میں اُن کا شعری رویّہ جہاں عورت کی بے بسی و مظلومیت اور اُس کے دَرد و کرب کی مؤثر ترجمانی کرتا ہے تو وہیں انہوں نے اُن تمام سماجی برائیوں کو بھی طنز و رمز کا ہدف بنایا ہے کہ جو سیاسی بازی گروں ہی کی دَین کہی جا سکتی ہیں۔ رُوبینہ میر کے غزلیہ حصے میں نہ تو روایتی حسن و عشق کا تذکرہ ہے اور نہ ہی مخربِ اخلاق اور حیا سوزی والے اشعار نظر آتے ہیں بلکہ وہ تو حال سے زیادہ مستقبل کی فکر مند شاعرہ معلوم ہوتی ہیں۔ بدلتے ہوئے تہذیبی و ثقافتی منظر نامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ امن و آشتی کی متمنی، مسلم اسلاف کی متاعِ عزیز اور اسلامی تہذیب و کلچر کو نجاتِ انسان کا مؤثر ذریعہ خیال کرتی ہیں۔ مزید برآں دُنیا کی بے ثباتی اور موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی پہ کامل یقین، نیک اعمال کی فِکر اور حدِ امکاں سے آگے کی سوچ روبینہ میر کا شعری اختصاص ہے۔ رُوبینہ میر کے محولہ اشعار میں زمانے، ماحول و معاشرے کے تلخ حقائق کا تجربہ و مشاہدہ قاری کو غور و تدبر پہ راغب کرتا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ رُوبینہ میر کا شعری سفر اگر اسی پاکیزہ ذوق و شوق کے ساتھ جاری رہا تو وہ دِن دُور نہیں جب وہ نسائی شاعری میں ایک منفرد اور اہم دستخط قرار پائیں گی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، لین نمبر ۳، مکان نمبر ۷، فردوس آباد، نجواں، جموں توی

اس خاتون شاعرہ کو میں متواتر ریاستی اخبارات کے ادبی صفحات پر دیکھتا رہا۔ غزل کے حوالے سے ان کی کاوشیں کئی بار متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اور خواہش تھی کہ ریاست کی اس ابھرتی آواز کو بھرپور طریقے سے سُنا جائے۔ اور اس کا موقع خود از راہِ مروت رُوبینہ میر نے اس حکم کے ساتھ فراہم کیا کہ یہ ناچیز ان کے کلام کے دوسرے مجموعے "تفسیرِ حیات" کے لئے اپنی کچھ نہ کچھ اناپ شناپ تحریر کرے۔ میں نے ان کا یہ آنے والا مجموعہ جستہ جستہ دیکھا ہے۔ ان کی غزلوں کا اپنا منفرد لہجہ ہے، عموماً ایک روانی ہے جو قاری کو بہالے جاتی ہے، ان کے موضوعات زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات پر مبنی ہیں اور اپنے احساسات کو وہ خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر پیش کرتی ہیں، ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ شاعر کو اپنے موضوعات کو اپنے معیار کی کسوٹی پر پرکھ لینا چاہئے، یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ایک احساس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے ایک خصوصی حیثیت اور حسیت کی شاعری تخلیق کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔ رُوبینہ میر کی غزلوں سے درجنوں ایسے اشعار کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو اس خصوصی زمرے میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ رُوبینہ میر کا یہ مجموعہ ہمارے اُردو شاعری کے خزانے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ اور اس مجموعے کے شاعر کو اپنی شعری شناخت دلوانے میں کامیاب ثابت ہوگا۔

میر ایاز رسول نازکی، ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ، مطابق ۹ جولائی ۲۰۱۴ء